ساری دنیا کا اندھیرا ایک شمع کی روشنی کو نہیں بجھا سکتا

میرا بھائی

برہم ناتھ دت

ایڈیشن .... اوّل

سنہ اشاعت ۱۹۶۶ء

تعداد .... ایک ہزار

مطبع .... دِلّی پرنٹنگ ورکس دہلی

مصنّف و ناشر .... برہم ناتھ دت

ملنے کا پتہ .... ۱۷ اکرشنا مارکیٹ امرتسر

قیمت فی جلد .... چار روپے

DR. SYED MAHMUD M.P.

نذر
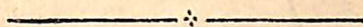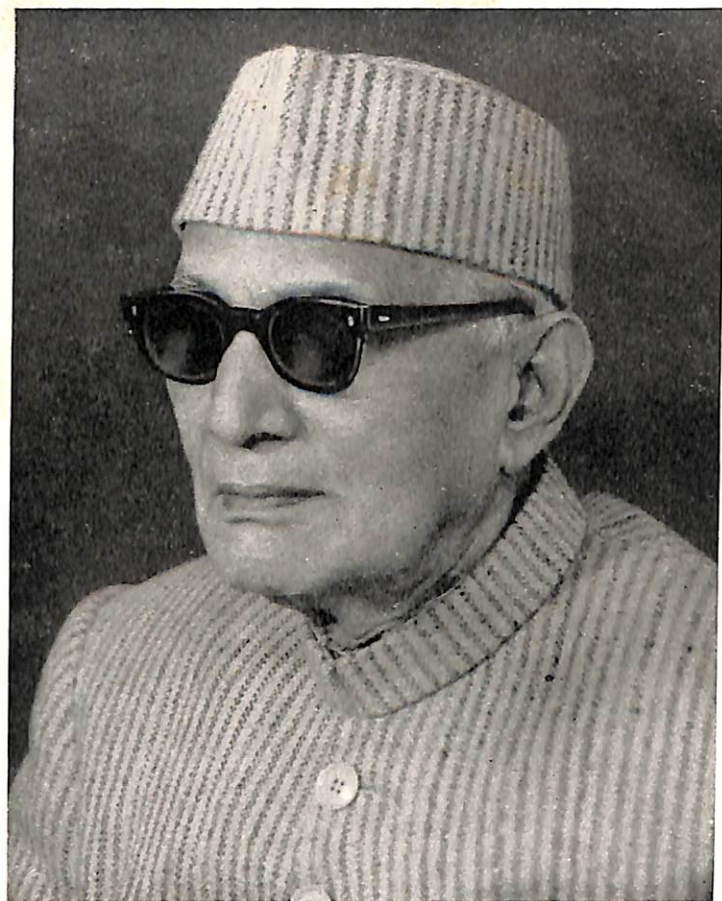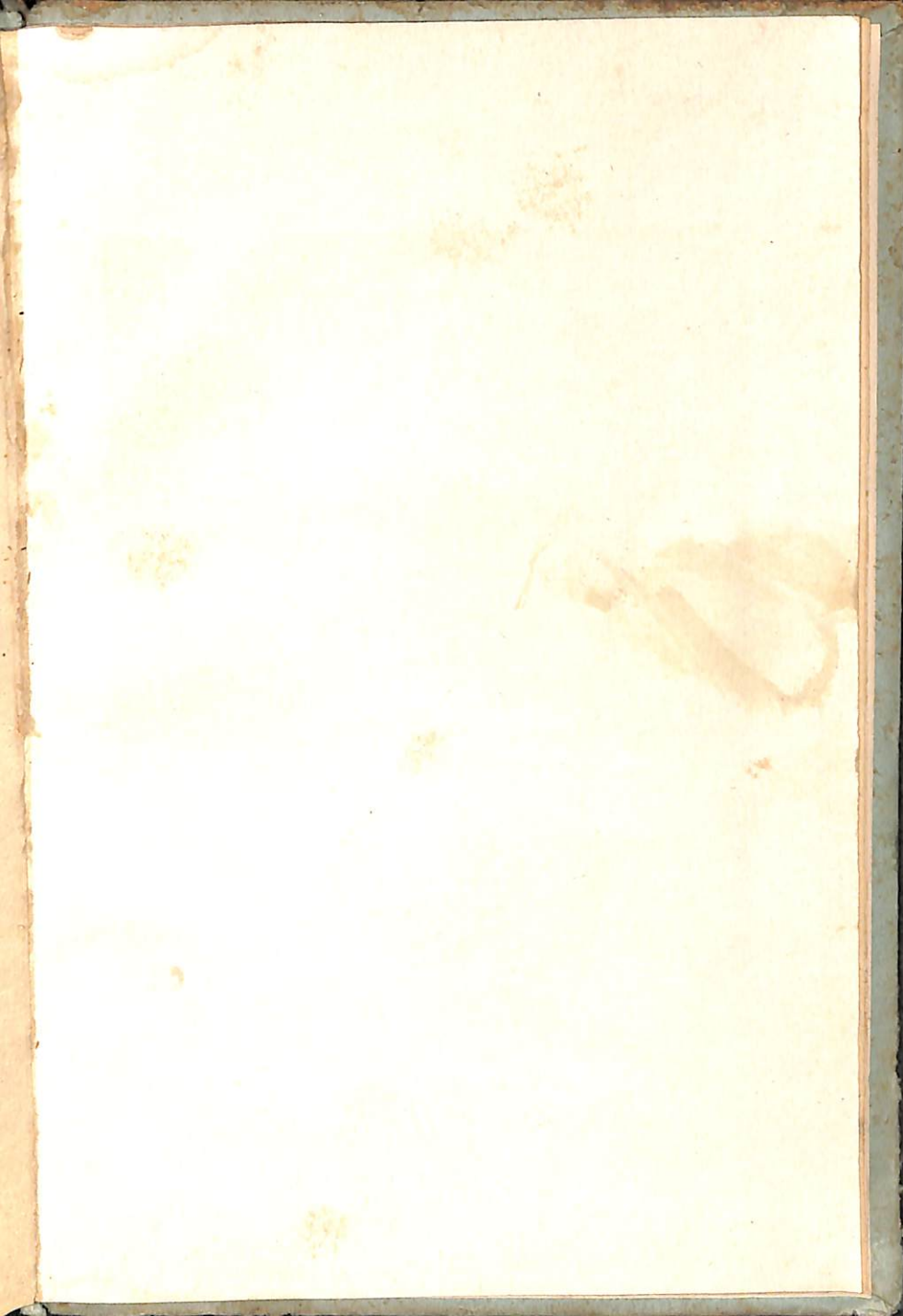
"میرا بھائی"

بصد احترام اپنے بھائی

ڈاکٹر سید محمود صاحب رکن پارلیمان نئی دہلی

کی نذر کرتا ہوں

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم
ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم — ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم
بگوشہ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے برہگذر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالبؔ
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

خاکسار

برہم ناتھ دت

ترجمہ

آ مری جاں روشِ چرخ کو واژوں کر دیں
گردشِ جام سے طالع کو دگرگوں کر دیں

دیدہ و دل کو تجلّی گہِ نظارہ کریں
بدن و روح سے ہنگامِ زیاں چارہ کریں

خلوتِ اُنس کا ہر غرفہ و در بند کریں
سعیِ درباں سے درِ فتنہ و شر بند کریں

محتسب سے کوئی اندیشۂ پرسش نہ رہے
ارمغانِ شہِ ذی جاہ کی خواہش نہ رہے

نہ کریں بات اگر بات کیا چاہیں کلیم
نہ ضیافت کریں مہماں ہوں اگر ابراہیم

فرش پھولوں کا ہو اور راہ میں چھڑکائیں گلاب
گوشۂ وصل ہو اور ذوق فزا جامِ شراب

ناصرؔ اس وصل کے منکر کو دگرگوں کر دیں
آ مری جاں روشِ چرخ کو واژوں کر دیں

राष्ट्रपति भवन, नई दिल्ली-4
RASHTRAPATI BHAVAN,
NEW DELHI-4

July 31, 1966.

I read with great interest Sri Braham Nath Datta's typescript on "My Brother". It is a valuable account of our rural life and problems relating to it.

(S. Radhakrishnan)

ترجمہ:

میں نے شری برہم ناتھ دت کی کتاب "میرا بھائی" کا مسودہ نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ میرے نزدیک یہ کتاب ہماری دیہاتی زندگی اور متعلقہ مسائل کی قابل قدر روداد ہے۔

تقدیم

از

بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریۂ ہند

ہر کہانی کہنے والا جب دوسروں کی باتیں بیان کرتا ہے تو اس کے ساتھ کچھ کیا، بہت کچھ اپنے دل کی بات بھی کہہ جاتا ہے۔ کبھی صاف صاف اور کبھی اشاروں میں۔ برہم ناتھ دت صاحب نے جو کہانی بیان کی ہے، اس میں بڑی ہی بصیرت افروز باتیں کہہ دی ہیں۔ جن میں خود ان کی زندگی کی جھلک صاف سامنے آتی ہے۔

"میرا بھائی" میں دیہاتی زندگی کے منظر سیدھے سادے انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں ہر بات جانی پہچانی سی لگتی ہے کوئی بات ایسی نہیں جو ہماری زندگی سے براہِ راست تعلق نہ رکھتی ہو۔ یہی سچی حقیقت نگاری ہے۔ اس روز کی زندگی میں برہم ناتھ دت صاحب نے اپنی انسان دوستی کے خیالات کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ کہیں آورد نہیں ہر جگہ آمد ہی آمد ہے۔

"میرا بھائی" میں دیہاتی زندگی کے مختلف کردار بھرپور انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں جیسے ایک جسم نامی کے اعضاء ہوں۔ اگر ایک عضو میں چبھن محسوس ہو تو سارا جسم تلملا اٹھتا ہے۔ فرقہ واری ہم آہنگی کے منظر نہایت

دلنشیں اور قدرتی انداز میں پیش کئے ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی ایک ہی کل کے اجزار معلوم ہوتے ہیں۔ جو اجتماعی زندگی میں اپنا اپنا فرض منصبی قدرتی طور پر انجام دے رہے ہیں۔ نہ کہیں "پروپاگنڈے" کی دھن گرج ہے نہ وعظ و پند کی کھوکھلی لفاظی جو طولِ داستاں کیلئے ہوا کرتی ہے۔

کتاب کے موضوع کی طرح طرزِ تحریر میں سادگی سنجیدگی اور خلوص ہے جس کی تاثیر غیر مشتبہ ہے۔ ہر شخص کا بات کہنے کا ڈھنگ الگ ہوتا ہے جس میں اس کی شخصیت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ "میرا بھائی" میں برہم ناتھ دت صاحب کی دلنواز شخصیت مکمّل طور پر ظاہر ہو گئی ہے۔ یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہمارے نوجوان اسے پڑھیں اور اپنی زندگی کو سنوارنے اور خیالات کو جلا دینے میں اس سے مدد لیں۔

چند تاثرات

از

پدم بھوشن علامہ نیاز فتحپوری

کسی کتاب کا پیش لفظ، دیباچہ، تعارف یا مقدمہ لکھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو میں بار ہا اس مشکل سے گذر چکا ہوں۔ لیکن باور کیجئے میری زندگی میں یہ بالکل پہلا موقع ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر دیر تک میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ

"کیا لکھوں، کیونکر لکھوں"

"میرا بھائی"۱ یوں تو بظاہر سرگذشت ہے کسی شخص کی جسے چودھری صاحب "میرا بھائی" کہتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف انہیں کا نہیں بلکہ ہم سب کا بھائی ہے اور ایک آئینہ ہے جس میں ہم سب کو اپنی اپنی صورت نظر آتی ہے۔ بُری بھی اور اچھی بھی!

چودھری صاحب بڑے پُرگو شاعر، بڑے خوش فکر ادیب، بڑے وسیع المطالعہ حکیم و فیلسوف ہیں۔ لیکن یہ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن

---

۱ مصنّف

میں کوئی نہ کوئی ہمسر بھی مل سکتا ہے۔ مگر ان کی وہ بلند فطری خصوصیت جو مجھے کہیں اور نہیں ملتی (یہاں تک کہ "تکلف برطرف" مجھ میں بھی نہیں) ان کا پرستارِ انسانیت ہونا ہے۔ اور یہ کتاب دراصل اسی "مجروح انسانیت" کی داستان ہے، جس میں ہم، آپ نہیں بلکہ اہرمن و یزداں کے کردار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور اس خوبی کے ساتھ کہ

"کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست"[1]

موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب اصلاحِ معاشرہ کے ذیل میں آتی ہے اور یہ موضوع ضرورت کے لحاظ سے کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، لیکن ہے نہایت غیر دلچسپ اور خشک و بے مزہ چیز! یہاں تک کہ "پند و موعظت" اور "ناصحِ مشفق" کی ذات ہماری شاعری کا ایک اہم جزو ہو کر رہ گئی ہے جس کے تلخ نصائح سے بچنے کے لئے سب کچھ گوارا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بقول جلال لکھنوی ؎

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کیلئے　　اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کیلئے

الغرض پند و نصیحت کوئی خوشگوار چیز نہیں اور مشکل ہی سے طبیعت اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس کتاب میں یہ تلخ گھونٹ اس خوبی سے ہمارے حلق سے اتارے گئے ہیں کہ زہر بھی ہمیں "تلخابۂ شیریں" محسوس ہوتا ہے اور یہ فاضل مصنف کا محض اعجازِ ادب و اسلوبِ بیان ہی نہیں بلکہ ان کی نفسیات دانی کا بھی نتیجہ ہے۔

---

[1] ترجمہ "فرشتے بھی نہیں ہیں واقفِ حال"

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ کہانی ہے ایک متوسط الحال گھرانے کی، جس میں بتایا گیا ہے کہ خاندانی روایات کے زیرِ اثر ہم کو کس کس موڑ سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور اس کی بنیاد پر معاشرہ کا جو ڈھانچہ تیار ہوتا ہے وہ ہمارے ذہن و فکر اور معمولاتِ زندگی پر اتنا اثر انداز ہوتا ہے کہ آخر کار وہ عقیدۂ مذہبی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہمارے عزیز دوست نے زندگی کی انہیں پیچیدہ راہوں اور معاشرہ کی انہیں گتھیوں کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے اور اس خوبی کے ساتھ "اورامِ حیات" کی جراحی کی ہے کہ خون سے بھرا ہوا طشت تو بیشک ہمارے سامنے ہوتا ہے لیکن "نشترِ فصّاد" کہیں نظر نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ فاضل مصنّف کی اس کامیابی کا راز (جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا) صرف ان کا دل نشیں اسلوبِ بیان ہی نہیں بلکہ ان کی "نفسیّاتِ دانی" اور "نبّاضئ فطرت" بھی ہے۔ جو بنیاد ہے اس داستان کی۔ اور روح ہے ان کے ادب وانشا کی۔

ضروری نہیں کہ اپنے اس دعوے کی تائید و توثیق میں کتاب کے اقتباسات بھی پیش کروں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب آپ اس کتاب کا مطالعہ شروع کریں گے تو اس کو ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئیگا اور آپ خود محسوس کریں گے کہ اس تمام لطف اندوزی کا تعلق ان نفسیاتی رموز سے ہے جس کا SYMBOL ان کے نزدیک "میرا بھائی" ہے اور میرے نزدیک "زخمہ بر تارِ رگِ جاں مے زنم"[1]

---

[1] ترجمہ "مضراب کی ہے ضرب رگِ جاں کے تار پر"

از

ڈاکٹر تارا چند رکنِ پارلیمان

گاؤں کی زندگی دور سے بہت سادہ اور بے ریا معلوم ہوتی ہے۔ دیہاتی اصلیت سے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ ان میں تصنّع و بناوٹ کا نہ ہونا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر نہ تو وہ زیادہ مالدار ہوتے ہیں اور نہ انتہائی مفلس، اس لئے معمولاتِ زندگی میں ان کا ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو جانا کہ ان میں خود غرضی نفسا نفسی اور حسد کا شائبہ بھی دکھائی نہ دے کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ گاؤں کی آب و ہوا صحت بخش ہوتی ہے۔ سماجی فضا بھی آسودگی بخش ہو تو کیا عجب؟

برہم ناتھ دت کی کتاب "میرا بھائی" پڑھتے وقت اس قسم کے خیالات کا دل میں آجانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نقشِ صد رنگ کے کئی اور پہلو بھی ہیں۔ کہانی بتاتی ہے کہ انسان صرف انسان ہی نہیں، حیوانِ مطلق بھی ہے۔ گاؤں یا شہر کا ماحول، ہو سکتا ہے اس کے ذہنی و مجلسی تصورات میں کسی تبدیلی کا باعث بن سکے۔ مگر فطری کیفیت میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ ایثار، ہمدردی، قناعت، محبت، وہ ستودہ صفات

ہیں جو انسان کو انسان بنا دیتی ہیں۔ خود غرضی، ریاکاری، رعونت، حسد رذالت و ذلالت کی نشانیاں ہیں جو انسان کو حیوان مطلق بناتی ہیں۔
خوب و زشت کی یہ پرچھائیاں محلوں پر محیط ہیں۔ مٹی کے گھروندوں میں پائی جاتی ہیں۔ تہذیب و تمدّن کی روشنی سے جگمگاتے شہروں میں واقع ہیں اور تیرہ و تار پس افتادہ گاؤں پر چھائی ہوئی ہیں۔ عالموں میں ہیں، اور جاہلوں میں بھی۔
ایک غریب گوجرا در بوریا نشین مولوی اپنے کردار میں لکھ پتی سیٹھوں اور یونیورسٹی کے سند یافتہ خوش پوش اور خود پسند نوجوانوں سے منزلوں آگے ہو سکتے ہیں۔ وقت آئے تو ضمیر کی آواز دنیا داری کے تمام مشوروں کو رد کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا موقع بھی آجاتا ہے جب لالچ، ظاہرداری، خود نمائی یا خود فریبی (ایسے شخص کو جس نے گھر بار زمین مکان کو اپنی ضمیر کی خاطر قربان کر دیا ہو) بے راہ روی کی طرف مائل کر دے اور محض بیوی کی دلجوئی کی خاطر وہ اپنے روحانی سکون کو کھو بیٹھے۔ خودی ایک نوجوان کو تباہ کر دیتی ہے تو خودداری اسے فرشتہ بنا دیتی ہے۔
"میرا بھائی" کے اشخاصِ قصّہ دنیاوی لحاظ سے حقیر اور چھوٹے ہیں مگر ان کی دنیا اتنی وسیع ہے جتنی فضا کی وسعتیں۔ یا انسانی دل و دماغ کی فراخی۔ اس میں احساسات و جذبات کی ایک نئی اور نرالی دنیا آباد ہے۔ جس میں سب رنگ نمایاں ہیں۔ دل آویز بھی دل آزار بھی۔ اسی تخلیق میں بھلائی بھی ہے برائی بھی۔ زندگی کا مدوجزر بھی۔ انسانی تگ و دو کی دل شکن شکستیں

بھی اور دل پسند کامرانیاں بھی۔ پستیوں کی تاریکیاں بھی اور بلندیوں کی خوشنمائیاں بھی۔ مگر فاضل مصنّف کا اعجاز ہے کہ وہ قاری کو ان قوتوں کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیتا ہے جو پاکیزہ قدروں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی یہ تصنیف ہر طرح کی توصیف و ستائش کی مستحق ہے۔ برہم ناتھ دت کے ذوقِ سلیم اور شعورِ پختہ کی شہادت ہے ان کی ابیلی اور دلکش طرزِ تحریر کی بہترین نمایندہ ہے

یقین ہے کہ ان کی پہلی تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی نظرِ تحسین سے دیکھی جائے گی۔ اور مقبولِ خاص و عام ہوگی۔

یہ ایک خط ہے

از

علامہ محمد حسین عرشیؔ

آپ حیران ہوں گے ۔ اتنا لمبا خط ! ہاں صاحب اتنے بلکہ اس سے بھی لمبے خط ہوتے ہیں ۔ سب سے پہلے یہ رسم خود خالقِ کائنات نے ایجاد فرمائی اپنے بندوں کے نام لمبے لمبے خط لکھے اور اپنے نامہ بروں کو پیغمبر، نبی، رسول رشی اوتار (وغیرہ) کے لقب سے ملقب کر کے بھیجا ۔ رسول کہتے ہیں "صاحبِ رسالت" کو ۔ اور رسالت کا مطلب ہے خط یا پیغام ۔ توریت، زبور، انجیل، قرآن وید، زند اوستا سب خط ہی تو ہیں ۔ اسی طرح بعض مشاہیر نے طویل خط لکھے ۔ اس وقت امام غزالی کا ایک خط ذہن میں آ رہا ہے جو ماہنامہ فیض الاسلام (راولپنڈی) میں ترجمہ ہو کر کئی قسطوں اور کئی عنوانوں میں منقسم ہو کر شائع ہوا ہے ۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد کے نام نہایت ہی کام کی باتیں خاصی تفصیل سے لکھی ہیں ۔ یہ خط جو آپ کے سامنے ہے ایک بڑا بھائی (دت صاحب) اپنے چھوٹے بھائی (عرشی) کو لکھ رہا ہے ۔ اس میں ہے کیا ؟ اس میں ایک سادہ و رنگین داستان ہے، ایک چھوٹے بھائی کی، جو اس کے بڑے بھائی نے دنیا

سے رخصت ہونے سے پہلے مکتوب الیہ (عرشی) کے بڑے بھائی (رت صاحب) کو سنائی۔ اس بڑے بھائی نے ضبطِ تحریر میں لاکر اس کو خط کی شکل دے دی تاکہ اس کا چھوٹا بھائی (عرشی) داستان کے کرداروں سے وہ سبق حاصل کر سکے جس کی سفرِ زندگی کے ہر راہ رَو کو ضرورت ہے۔ جادۂ حیات کے تمام راہرو آدم کے بیٹے ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لحاظ سے یہ خط سب بھائیوں کے نام ہے اور سب کے کام کی چیز ہے۔

لیکن یہ سوال پھر بھی قائم رہا کہ اس میں ہے کیا؟ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی سفرِ زندگی میں ضرورت ہے۔

زندہ رہنے کے لئے

اپنے نیش سے دوسروں کو بچانے اور دوسروں کے نیش سے بچنے (یا بحالاتِ مجبوری اس کو بردباری اور خوش اسلوبی سے سہہ لینے کے لئے۔)

ایک بہشتی معاشرے کی تشکیل کے لئے

شر پسند عناصر کی اصلاح کے لئے

ان کی مضرّت سے محفوظ رہنے کے لئے

گرتی ہوئی انسانیت کو اوپر اٹھانے کے لئے

سماج کے جسم کی ایک ایک بیماری کی تشخیص اور ان کے علاج کے لئے

جس جس چیز کی ضرورت ہے وہ سب چیزیں اس طویل خط کے اوراق میں ایک لذّتوں بھرے خوانِ نعمت کی شکل میں ترتیب دے کر

پیش کر دی گئی ہیں۔

اس کی زبان سادہ وسلیس

جملے دلکش ولذیذ

مطالب پُر مغز وعمیق

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعدؔی وتلسی داس نے دوبارہ (ایک ہی قالب میں) جنم لینے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اور موجودہ دور کے مذاق وحالات کو سامنے رکھ کر یہ گلدستہ تیار کیا ہے جو ہر نیکی پسند انسانیت دوست، تعلیم یافتہ شخص کی میز پر آراستہ ہو کر اپنے ماحول کو معطر کرتا رہے گا۔ اور اس کی خوشبو کبھی ختم نہ ہوگی۔ نسل درنسل آگے چلتی جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح گلستان اور رامائن زندہ وپائندہ چلی آرہی ہیں۔

* * *

میرا بھائی پر میرا تاثر

از

مولانا محمد اجمل خاں (معتمد مولانا آزاد) رکن پارلیمان نئی دہلی

شاعرِ مشرق ٹیگور کا قول تھا کہ شعر ہو یا افسانہ، اگر حقیقی زندگی سے دور ہوگا تو بے معنی ہوگا۔ لہٰذا اگر سماج کی کسی کیفیت کو بیان کرنا چاہتے ہو تو جس طبقے کا ذکر کرنا ہے اسی میں رہ کر زندگی بسر کرو۔ تب تمہارا افسانہ حقیقت بن جائے گا۔ تمہارا شعر واقعی شعور ہو جائے گا اور جو کچھ کہو گے وہ جادو کا اثر رکھے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دتؔ صاحب اپنے کرداروں کی نفسیاتی گہرائیوں میں گھس کر فلسفۂ زندگی سے دوچار ہوئے ہیں۔ وہ مفلس طالب علم، غیور ماں، فیاض دوست اور دیہات کے باشندوں کی فطرت سے بخوبی آگاہ ہیں بلکہ انہی میں سے ایک ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ افسانہ نہیں ہے ہندوستان کے سماجی مدوجزر اور نفسیاتی کیفیتوں کی واقعی اور سچی تاریخ ہے۔ اور انکے احوال ان کی امیدوں اور رزم و بزم کا ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔ مصنف اپنے اس کارنامے پر مستحقِ مبارکباد ہیں۔

نذر

از

مولانا سیّد محمد جعفر شاہ پھلواروی

"میرا بھائی" میرے بھائی کی لکھی ہوئی مختصر سی کتاب ہے۔ میں نے اسے لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً پڑھا۔ میرے بھائی چودھری برہم ناتھ دت نے جہاں اپنا مسوّدہ ارسال فرمایا وہاں ایک خط بھی لکھا جس کا ایک جُملہ یہ تھا کہ

"جہاں جہاں مناسب سمجھیں تبدیلی فرمادیں"

تبدیلی تو میں کیا کرتا! البتہ کتاب پڑھ کر خود تبدیل ہوگیا۔ اپنی اندرونی دُنیا، اپنی روح اور اپنے ذہن میں مجھے ایسے گوشے نظر آئے جن کو تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ میرا قلم اس کتاب کے کسی لفظ پر نہ چلا مگر اس کتاب نے کئی جگہ میرے صفحۂ ذہن پر قلم چلا دیا اور بعض جگہ تو شیطنت کا سر قلم کر دیا

یہ ایک کہانی ہے بڑی دلچسپ، اور اس سے زیادہ اثرانگیز اور اس سے بڑھ کر سبق آموز۔ پڑھنے والے کے ذہن پر وہ اثر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے جو مصنّف ڈالنا چاہتا ہے۔

مصنّف براہِ راست کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ باتوں باتوں میں کہہ جاتا

ہے مگر اثر کے لحاظ سے براہِ راست بات کہنے سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز ہے۔ خود مصنف علامہ جس اعلیٰ انسانیت کے علمبردار ہیں، اس کے جلوے شروع سے آخر تک کتاب میں نمایاں ہیں۔ مکافاتِ عمل گویا اس کا THEME ہے۔ یعنی انسان کے اچھے بُرے عمل کا نتیجہ کسی نہ کسی شکل میں اسی دنیاوی زندگی میں ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔

پھر جہاں کی منظر کشی ہے وہیں کے ماحول اور نفسیات کے مطابق کی ہے۔ زبان بڑی شستہ، رواں اور اثر انگیز ہے اور خیالات پاکیزہ۔

آٹھ دن سے صاحبِ فراش ہوں اس کے باوجود مشکلوں سے مسودے کا ایک ایک لفظ دیکھ گیا اور دشواری اور مشکل سے یہ چند سطریں اپنے بھائی کی "نذر" کر رہا ہوں۔ امید ہے وہ اسے قبول فرما کر میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں گے۔

میرے بھائی

از

پدم شری پروفیسر رشید احمد صدیقی

برہم ناتھ دت کی یہ تصنیف (میرا بھائی) ہر "مدح و منزلت" کی مستحق ہے۔ کتنے معمولی اشخاص، حالات و واقعات اور ماحول کو کس درجہ دل آویز، محترم و مؤثر بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے بشرطیکہ پڑھنے والے میں کچھ اخلاقی صفات ہوں۔ اور فنی شناخت کا بھی تھوڑا بہت ملکہ ہو۔ میں فن اسے سمجھتا ہوں جس کے وسیلے سے دل میں شرافت، حُسن اور صداقت کا احساس پیدا ہو۔ ورنہ وہ فن نہیں، فتنہ فسق یا فساد ہے۔

فن کتابی یا میدکانکی نہیں ہوتا۔ انفرادی و اخلاقی ہوتا ہے۔ یہ بات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو جائے گی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اچھی اور بڑی تصنیف وقیع تر ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اسی نسبت سے مصنّف کا نام فراموش ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر یہی صورت اس کتاب کو بھی پیش آجائے۔ لیکن مجھے یقین ہے مصنّف کا نام جلد یا آسانی سے نہیں بھلایا جا سکے گا۔ کتاب کی تفصیل و تعارف میں بڑا وقت

صرف ہوگا۔ محنت اور کاغذ بھی! یہ سب ممکن تھا، سوا محنت کے جواب مجھ سے نہیں ہوتی۔ کچھ یوں بھی ہے کہ محنت کرنے میں جی بھی نہیں لگتا۔ اس سے بھی زیادہ میرے لئے دشوار کام یہ ہے کہ مصنّف کو روشناس کراؤں۔ بات صاف ہے۔ یعنی تصنیف میں جو خوبیاں ہیں وہی خوبیاں مصنّف کی ہیں۔ بڑے کو بڑا دکھانا مشکل نہیں، چھوٹے کی بڑائی پہچاننا اور منوانا بڑا کٹھن ہے۔ اور یہ کام بھی مصنّف نے کر دکھایا۔

اس کتاب میں مصنّف نے تخلیق کا بھی کمال دکھایا ہے۔ کتاب میں کہیں صنّاعی یا تکلّف نہ ملے گا۔ نہ چابکدستی نہ درازدستی نہ زبان درازی۔ لیکن اثرانگیزی کے اعتبار سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معلوم نہیں کتنے دریاؤں کے موتی فراہم کئے ہوں گے۔

"تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا"

کتاب مختصر ہے، قصّہ گھریلو، ماحول اور اشخاصِ قصّہ بھی جانے پہچانے ہوئے، ہیں۔ لیکن ان کی ترتیب و تنظیم میں مصنّف کا احساسِ ایمان و یقین بڑا عظیم و حسین نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں اور گمنام رہنا پسند کرتے ہیں۔ اچھا ہونا اور گمنام رہنا بڑائی کی نشانی ہے۔ یہ بڑائی ہر ہم نامہ دت میں ملتی ہے

دیہات کی عورتیں کتنی عورت اور ان کے مرد کتنے مرد نظر آتے ہیں گاؤں کی زندگی کا نقشہ اس کتاب میں جس سادگی سچائی اور شرافت سے کھینچا گیا ہے۔ اس سے اس نادار مظلوم، کس مپرس طبقے کی منزلت ہمارے دلوں

میں راسخ و روشن ہو جاتی ہے جن کو ہم نے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ــــــ
سب سے پہلے اس کی طرف پریم چند کی نظر گئی۔ اس کی تقلید سب نے کی
لیکن بن کسی سے کچھ نہ پڑا۔ اکثر خیال آیا ہے کہ جس طرح غریب اور کسان
ہمیشہ سے متموّل طبقے کے ستم کا شکار رہے ہیں اسی طرح آجکل بیشتر
افسانہ نگاروں یا نیتاؤں کا بھی ہدف بنے ہوئے ہیں۔ پریم چند کی
انسان دوستی کی بازگشت کتنے دنوں کے بعد اس کتاب میں سنائی دی۔
اس زمانے کے افسانہ اور افسانہ نگاروں کی کرامات جوان عورت ہی کے
محور پر گھومتی ہیں۔ "میرا بھائی" میں عورت پیش پیش نہیں ہے۔ ہے بھی تو اپنے
شباب یا جنسی کشش کے سبب سے نہیں، تمام تر اپنی فطرت کی بناء پر۔ بعض
لوگ سر کے سہارے سے کہتے ہیں۔ بعض کے ہاں دل کی آواز سنائی دیتی ہے
لیکن زیادہ تعداد ایسوں کی ہے جو پیٹ یا اس کے زیریں حصّے کے بل پر اپنی
دوکانیں سجاتے ہیں۔ پہلے علاّمہ ہیں، دوسرے عارف اور تیسرے اوباش۔
عارفوں میں میرے بھائی "برہم ناتھ دت" ہیں۔ ان کیلئے دل سے دعا نکلتی ہے
شاد باش و شاد زی![1]

اس کتاب کا کمزور حصّہ وہ ہے جس کو تعارف تمہید یا دیباچہ کا نام
دیا گیا ہے۔ یہ تصنیف اس طرح کی رسم سے بلند ہے۔ میں ہرگز کچھ نہ
لکھتا اگر یہ نہ جانتا کہ اس سے مصنّف غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مجھ سے

---

[1] "خوش رہو اور خوش جیو"

آزردہ یا مایوس ہوں گے جو مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ اس لئے شادیانا شادُ خانہ پُرّی کردی۔ لیکن جو لکھا ہے اسے درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا!

ذکر و فکر

از

علامہ ڈاکٹر وارث سرہندی

تقسیمِ ہند سے پہلے چودھری برہم ناتھ دت صاحب کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد ماہنامہ "نگار" میں ان کے شذرات پڑھ کر ان کے علمی و ادبی کمالات سے تو شناسائی ہو گئی مگر ان کے اپنے متعلق کچھ اس سے زیادہ واقفیت حاصل نہ کر سکا خوش بختی سے ماضی قریب میں ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی میں ان کی ایک نعت دیکھی تو چونک اُٹھا۔ چونکنے کی بات ہی تھی۔ ایک ہندو اور اتنی پاکیزہ و پرخلوص نعت! سبحان اللہ!

عہدِ حاضر ہر چند ذہنی ترقی اور بلند نگاہی کے لئے مشہور ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پہلے صرف مذہبی تعصب کی لعنت تھی، اب نسلی ملکی اور صوبائی اور نہ جانے کتنے تعصبات ہیں کہ انسانیت الاماں! الاماں! پکار اٹھی ہے۔ ان حالات میں دت صاحب ایسے وسیع القلب اور بلند نظر انسان کا وجود میرے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کسی طرح کم نہ تھا جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا وطنِ مالوف وہی ہے جو میرا وطنِ ثانی ہے تو ایک نسبتِ قریبہ پیدا ہو گئی۔ بعدہٗ جب ان کی متعدد تصانیف کا مطالعہ کیا تو ان

کی دلنواز شخصیت کے دوسرے پہلو بھی سامنے آ گئے۔

بقول محمد حسین آزاد مرحوم "رغبتوں کا اتحاد موافقتِ صحبت کا باعث ہوتا ہے" چنانچہ وت صاحب سے خط و کتابت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ مختلف علمی و ادبی امور زیرِ بحث آنے لگے اور باہم افادہ و استفادہ کا سلسلہ جاری ہو گیا جو بفضلِ خدا "تا ایں دم" قائم ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی قائم رہیگا۔

یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ موصوف نے اپنی تازہ ترین تصنیف "میرا بھائی" کا مسوّدہ مجھے بھیجا اور میری رائے کو اس میں شامل کرنا چاہا تعمیلِ ارشاد میں یہ چند سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں جن کو تنقیدی رائے سے زیادہ "میرے ذاتی تاثرات" کہنا مناسب ہو گا۔ اس لئے بھی کہ میرا رجحان تاثراتی تنقید کی طرف زیادہ ہے۔

"میرا بھائی" کو میں نے بڑے شوق اور غور سے پڑھا۔ اس میں نہ تو جا بجا تعطّل (SUSPENSE) پیدا کر کے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور نہ کوئی حیرت انگیز کارنامہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کوئی جاسوسی یا رومانی کہانی بھی نہیں۔ پلاٹ میں کوئی پیچیدگی نہیں بلکہ سپاٹ ہونے کی حد تک سیدھا سادہ ہے تاہم جاذبیّت کا یہ عالم ہے کہ ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر چین ممکن نہیں۔ یہ کہانی اپنے اندر ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہے اور بقولِ غالب ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

زبان اور بیان کی شگفتگی، حلاوت اور قصّہ کی تعمیر و ترتیب نے مل ملا کر کچھ ایسا

اثر پیدا کر دیا ہے کہ قاری کھو سا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنی اثر میں ڈوبی ہوئی کہانی میں نے اس سے پہلے شاید ہی پڑھی ہو۔

اس کی وجہ صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ دتّ صاحب کا قلم زندگی کے بہت قریب ہو کر چلتا ہے۔ اور زندگی پر تصنّع کے جو دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں ان کو آہستہ آہستہ اپنی نوک سے اٹھاتا چلا جاتا ہے تاآنکہ زندگی کے حقیقی خد و خال نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ میں اسے ان کی کردار نگاری کا کمال سمجھتا ہوں۔ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب مصنّف اپنے کرداروں کی ہر تفصیل اور ہر جُز سے پوری طرح واقف اور ان کی نفسیاتی کیفیّات سے کماحقہٗ آگاہ ہو۔ اس کہانی کے مطالعہ سے (جس کو اصطلاحی زبان میں آپ ناولٹ (NOVELETTE) کہہ سکتے ہیں) واضح ہو جاتا ہے کہ دتّ صاحب اپنے کرداروں سے نہ صرف قریبی واقفیّت رکھتے ہیں بلکہ ان میں سے ایک ہیں۔ گویا یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے۔ ایک فنکار کا کمال بھی یہی ہے کہ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرے۔ فن اور فنکار میں جب تک دوئی کا پردہ حائل رہتا ہے کوئی شاہکار معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ کہیں کہیں البتّہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ان کے کردار مختلف اقدار کے علائم (SYMBOL) ہیں۔ اور اس طرح یہ ایک تمثیلی کہانی[ے] بن جاتی ہے۔ ایسے فنکاروں کی سب سے بڑی خامی یہ ہوتی

ے ALLEGORICAL STORY

ہے کہ فن مقصد کے تابع ہو کر اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے اور سراسر وعظ و تبلیغ بن کر رہ جاتا ہے۔ فنکار کا مقصد "وہ کچھ" بیان کرنا نہیں ہوتا جو ہو رہا ہو بلکہ "وہ" جو اس کی رائے میں ہونا چاہیئے۔ گویا فنکار استقبال کو ماضی اور حال کے آئینہ میں منعکس کرنے اور اپنے تصورات و مفروضات کو حقیقت کا رنگ دے کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں اچھے اچھے ماہرانِ فن ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اور وہ توازن و تناسب جو فن اور مقصد میں قائم رہنا ضروری ہے، برقرار نہیں رکھ سکتے۔ وہ جوشِ اصلاح میں فنی اقدار کو مجروح کر دیتے ہیں۔ اور حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے ناول جو فی الحقیقت تمثیلیں (ALLEGORIC) ہیں اسی انتہا پسندی کا شکار ہو گئیں۔ اور ان کے کردار جیتے جاگتے دکھائی نہیں دیتے بلکہ پرچھائیاں بن کر رہ جاتے ہیں۔

دتؔ صاحب کی خوبی اور بڑائی یہ ہے کہ ان کے کردار مخصوص اقدار کے نمائندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کے بہت قریب ہیں اور ہمارے آس پاس چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی مصنّف کا بے پایاں خلوص اور جذبۂ تعمیرِ انسانیت ہے جو از اوّل تا آخر جاری و ساری ہے۔ اگرچہ اس باب میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ یوں بھی کسی شاہکار کا تعارف تحصیلِ حاصل ہے۔ دتؔ صاحب کی ذاتِ گرامی اور انکی تصنیفِ لطیف محتاجِ تعارف نہیں۔ انیسؔ کے الفاظ میں بڑے وثوق اور اعتماد سے

یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں

"جوہر شناس ہے تو اسے موتیوں میں تول"

ابتدائیہ

ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

(غالبؔ)

اس کتاب "میرا بھائی" کی کہانی آپ کے لئے نہیں، اپنے بھائی عرشیؔ کے لئے لکھی تھی۔ جی چاہے تو آپ بھی سن لیجیئے۔ اس کا پہلا باب اپریل ۱۹۶۲ء میں لکھا جا چکا تھا۔ خیال تھا کہ کتاب ستمبر ۱۹۶۲ء میں ہی منظرِ عام پر آ جائے گی۔ پھر ایسا ہوا کہ "برگ وبار" اور "اہلِ سیف" کی کتابت وطباعت کی الجھنوں میں پھنس گیا اور یہ کام جہاں کا تہاں پڑا رہا۔ فراغت پانے کے بعد دوسرے غیر ضروری کاموں نے نرغہ میں لے لیا اور ادھر توجّہ نہ دے سکا۔ اسے حافظے کی بے وفائی کہیئے یا عمر کا تقاضا، مسودہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔ نئے سرے سے لکھنا مشکل ہو گیا ناچار جی ہار کر بیٹھ رہا۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں طبیعت کسی قدر راہ پر آئی تو پھر لکھنا شروع کر دیا۔ فروری تک چھٹی نشست کی ابتداء ہو چکی تھی کہ دفعتہً دہلی جانا پڑا گمانِ غالب تھا کہ کتاب اپریل ۱۹۶۳ء تک طبع ہو جائے گی۔ واپس آیا

تو اچانک وجع القلب میں مبتلا ہو گیا۔ دردِ دل کی افسانوی روایات اور اس کے خیالی تصورات سے تو بخوبی واقف تھا مگر یہ عملی تجربہ کچھ اور تھا۔ کرب کا یہ عالم تھا کہ حفظِ مراتب کے تقاضے بھی فراموش ہو گئے۔

لوگ مرنے ہی کے لئے بڈھے ہوتے اور بیمار پڑتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ

"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

اس لئے میں نے اس سانحہ کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ مگر متعلقین نے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ مفت کی دردسری مول لے لی اور درد کا درماں ڈھونڈنے لگے۔

دورانِ علاج میں (معلوم نہیں کیوں) رہ رہ کر مجھے کتاب کی تکمیل کا خیال آتا اور ساتھ ہی زندہ رہنے کی تمنا جاگ اٹھتی جو اس خواہش کا قدرتی نتیجہ ہونا چاہیئے تھی۔ مئی ۱۹۶۳ء میں ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ ہر چند نوشت و خواند کی اجازت نہ تھی۔ کبھی اپنے کو کبھی دوسروں کو دھوکا دیکر تھوڑا بہت لکھتا رہا۔ یہ کتاب اسی شوقِ فضول یا جرأتِ رندانہ کا نتیجہ ہے

ماضی کی کہہ چکا مستقبل پردۂ غیب میں ہے۔ اب حال کی سنئے روداد بہت مختصر ہے۔

میری دلی کیفیت کا مظہر، میری موجودہ تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز، میری حسرتوں اور ارمانوں کی تفسیر اصل میں اس بیان کا ابتدائی شعر ہی ہے جس کا وظیفہ میرا معمول بن چکا ہے۔ چاہتا ہوں کہ آپ اسے ایک مرتبہ اور سُن لیں ؎

ڈھونڈے ہے اس مغنیِّ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

تاکہ اس تفصیل کی ابتدا ہی اس کی انتہا ہو جائے اور اس کی انتہا اس کی ابتدا ——— اور پھر یوں بھی ہے، بقول استاذی حکیم طغرائیؒ رح

کہ سر آید جادۂ منزل گہ سرگشتگاں
اوّل و آخر نمے دارد خطِ پرکار[1] ہا!

ساہووال (گورداسپور) برہم ناتھ دت
۱۰ر اپریل ۱۹۶۵ء

---

[1] ترجمہ :- "گردشِ تقدیر کا اپنی ہو کیونکر خاتمہ
اوّل و آخر نہیں ہوتا خطِ پرکار کا"

میرا بھائی

برہم ناتھ دت

نظریہ

غریقِ آب شو یا اندر آتش سوز و بریاں شو
بہ ہر نوعے کہ باشد وجہِ خیرِ نوعِ انساں شو[1]

(طغرائی)

---

[1] ترجمہ۔ اے مخاطب! تجھ پر مصائب و آلام کے کتنے ہی پہاڑ ٹوٹ پڑیں تو بنی نوعِ انسان کی خیر و ہمدردی کو فراموش نہ کر۔

برہم ناتھ دت
۱۷ کرشنا مارکیٹ امرتسر
۱۳ راکتوبر ۱۹۶۳ء

بخدمت علامہ محمد حسین عرشی دار القرآن (گیتا بھون) لاہور

برادرِ محترم!

پروفیسر ڈاکٹر دولت رام پراشر عرف نکّو نے اپنے خصائل، اطوار اور اخلاص سے ہرکس وناکس کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ آپ بھی اس کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ مجھے تو اس سے خاص عقیدت اور محبّت تھی۔

اس کی خوبیوں اور بڑائیوں کا شمار و اعتراف کماحقہٗ نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک فاضل اور ہمہ دان معلّم تھا۔ نیک دل باپ، سعادت مند بیٹا، وفادار خاوند، مخلص دوست، فیّاض دشمن، ہمدرد ہمسایہ، شفیق بھائی، خدا دوست انسان، تعصّب اور تنگدلی سے ناآشنا۔

وہ سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ جو آہستہ آہستہ اسے گھُن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اس نے مجھے بُلا بھیجا۔ دیر تک آپ کے اور دوسرے دوستوں کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ پھر یکایک اس نے چونک کر کہا "تم میرے مخلص دوست ہو، پرانے لنگوٹیے۔

جس ماحول میں میرا گزر ہوُا ہے اور جن حالات و واقعات سے مجھے پالا پڑا ہے وہ دلچسپ، عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ انہیں سُن لو۔" دفعتہً پرانی یادیں میرے دل میں تازہ ہو گئیں۔ میں انہی خیالات میں غرق ہو گیا اور سُنی اَن سُنی کر دی۔ تامل کے بعد اس نے گھبرا کر میری طرف غور سے دیکھا، مجھے جھنجھوڑا اور یوں گویا ہوُا۔

"راست دروغ[1] بر گردنِ راوی" میرے دوست! مجھے بتایا گیا تھا کہ میں اور میرے اجداد خالق[2] کے منہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے میں اپنے آپ کو فائق اور معزز سمجھنے لگا۔ "میرا بھائی" میری ماں کے بطن سے پیدا ہوُا۔ چونکہ اس کی پیدائش عام انداز میں ہوئی تھی اس لئے وہ میری نظر سے اُتر گیا اور مجھے حقیر دکھائی دینے لگا۔ پیدا ہوتے ہی آغوں آغوں کر کے اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور ہاتھ پاؤں مار مار کر ہنگامہ مچا دیا۔ اس بے تمیزی نے اسے میری نظروں سے اور بھی گرا دیا۔

چلّے کی سردی تھی۔ دانت سے دانت بجتا تھا۔ دایہ نے زچّہ کیلئے "آتشِ سیّال" تجویز کی۔ مگر اُلٹی مت والیوں نے "مگس کی قے" دے دی۔ نتیجہ یہ ہوُا کہ ٹھنڈ کھا گئی اور جان کے لالے پڑ گئے۔ جلدی سے مہاجن کے گھر سے منہ مانگے دام دے کر برانڈی منگائی۔ اور لگا تار تین

---

[1] ترجمہ:۔ سچ جھوٹ روایت کرنے والے کی گردن پر

[2] براہمنو مکھے ماسیت (یجر وید)

یا چار چمچے اس کے دئے تو کہیں جان میں جان آئی۔" بامنی ہو کر شراب پی لی" یہ ایک طعنہ بن گیا جو تاحیات میری ماں کو سننا پڑا۔ ریاضت، کفّارہ گنگا جل کے باوجود یہ داغ اس کے ماتھے سے نہ دُھل سکا۔ اور نہ ملنے والی عورتوں ہی نے اس اضطراری لغزش کو بھلانے کی کوشش کی۔ حیلے حوالے اس بات کو لطف لے لے کر بیان کرتیں۔ اور میری ماں کو دکھی کر دیتیں۔ دن چڑھتے ہی رسمی رواجی بدھائی کے لئے برادری نے آنا شروع کر دیا۔ رات گئے تک یہ چہل پہل رہی۔ دادی خندہ پیشانی سے سب کو خوش آمدید کہتی اور بتاشے دے کر وداع کرتی۔ گاؤں کے محنت کش حلال کی روزی کمانے والے، جنہیں عرفِ عام میں "کمین" کہتے ہیں اپنا کام چھوڑ کر آئے اور ہولر کو درازیٔ عمر اور بلندیٔ اقبال کی مخلصانہ دعائیں دیں۔ دادی نے انہیں دھتکار دیا اور بعد کو آنے کے لئے کہا۔ مگر باپ نے بڑھ کر انہیں بتاشے دے دئے اور وہ خوش و خرّم واپس چلے گئے۔ مدرسے کے مولوی صاحب آئے تو انہیں تپاک و تعظیم سے چارپائی پر بٹھایا۔ اور میں دوڑ کر بُنجوں کے گھر سے ان کا حقّہ لے آیا۔ دادی نے ایک روپیہ اور بتاشے ان کی نذر کئے۔ انہوں نے جاتے جاتے میرے باپ سے کہا "دیکھنا! بھائی دصنپت! نکّو ہوشیار لڑکا ہے اس کی پڑھائی کا خیال رکھنا۔ فائدے میں رہوگے۔" باپ ہنس دیا اور کہا "مولوی جی! چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ دن پورے کر رہے ہیں۔ ببول کو پانی کس نے دیا۔ آپ سے آپ بڑھ جاتا ہے۔"

کل تک میں گھر کا تنہا چراغ تھا۔ ہر نو وارد مجھی کو پوچھتا اور لاڈ پیار کی بات کرتا۔ مگر اب گھر کا رنگ بدل چکا تھا۔ سب ہولر ہی کو پوچھتے۔ اس گہما گہمی میں مجھے بتاسہ تک دینے کا بھی کسی کو خیال نہ آیا۔ میری قسمت کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ اس بے مروتی پر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دن ڈھلے دادی نے پیار سے مجھے کہا "نکو! تیرے کھیلنے کے لئے کھلونا آیا ہے، تیرا بھائی۔" میں نے ٹال دیا اور کھسک گیا۔

میری عمر سات برس کی تھی۔ میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا رہ چکا تھا اور دادی کا اکلوتا پوتا۔ گھر میں قدر تھی اور باہر منزلت۔ مگر ایک ہی رات میں میری کایا پلٹ ہو گئی۔ ہولر سب کی توجہ کا مرکز بن گیا اور میں ناخواندہ مہمان کل تک ماں کے ساتھ لیٹ کر سوتا تھا، آج کونے میں میرے لئے پلنگڑی بچھا دی گئی اور ہولر نے میری جگہ لے لی۔ رات بھر سسکیاں بھرتا رہا۔ میرے دل میں بار بار آتا کہ حیف! کل کے لڑکے نے مجھے مار بھگایا۔ اور میری ساری مسرتیں مجھ سے چھین لیں۔!

تیسرے دن جوتشی آیا تو اس نے اور ہی گل کھلایا۔ زائچہ کھینچ کر بتایا کہ "دیکھو! سورج کتنے اونچے گھر میں پڑا ہے۔ دروازے پر ہاتھی جھولیں گے خدا عمر دراز کرے۔ یہ لڑکا تو نکو کو بھی مات دے گیا۔ بلا مبالغہ بڑا اقبال مند ہوگا۔" میرے باپ کی باچھیں کھل گئیں۔ میری طرف ایک دردمندانہ نگاہ ڈالی اور ہنس دیا۔ جوتشی دادی سے ایک روپیہ، گڑ کی بھیلی اور ایک دھوتی اینٹھ کر ہوا ہو گیا۔ مجھے جوتشی پر بڑا غصہ آیا۔ مگر میری بساط ہی کیا تھی۔ اس

کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ ناچار چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ دادی بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ماں کی چارپائی کے پاس لے جا کر کہا "دیکھ لے! یہ ہے تیرا بھائی!" ہر چند میں بچے کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا مگر اب اس سے ڈر سا معلوم ہونے لگا۔ میں نے ماں پر نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ نقاہت سے آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ اس نے پیار سے میرا منہ چوم لیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو پھوٹ نکلے۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ اور خوب رویا۔ بچہ جاگ اٹھا تھا۔ ماں نے اس کا منہ کھول دیا۔ پہلے اس نے منہ بسورا اور پھر مسکرا دیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ہکا بکا رہ گیا۔ کانپ اٹھا اور میں نے محسوس کیا کہ میری دنیا اجڑ چکی ہے۔ میری گہری نیلی آنکھیں اس بچے لے اڑا تھا۔ بس۔ گھبراہٹ اور سراسیمگی میں، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو کئی بار ٹٹولا۔ انہیں پا کر بھی میری ڈھارس نہ بندھی۔ خدا کی قسم! اس کی آنکھیں ہو بہو میری آنکھوں جیسی ہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ماں کے ناتواں اور نڈھال چہرے پر رنگ آ گیا۔ بچے پر پیار بھری نظر ڈال کر آہستہ سے کہا "نکو! تیرا بھائی عین مین تو ہی ہے"۔ دادی نہ چوکی، فوراً بول اٹھی "جوتشی کہہ گیا ہے کہ ہاتھی جھولیں گے۔ یہ نکو سے بھی زیادہ بھاگوان (خوش بخت) اور بلوان (طاقت ور) ہوگا"۔ پھر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی "پرماتما رام لچھمن کی یہ جوڑی تا ابد سلامت رکھے"۔ دادی اس وقت مجھے بہت بری لگی میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں "اپنے بھائی"

کو دیکھتا رہا۔ کبھی اپنی ہزیمت کا خیال آتا۔ تو نفرت کے جذبات اُبھر آتے۔ کبھی کہتا "کیا ہُوا! عمر میں بڑا ہوں، ہر پہلو سے بڑا بن کر دکھاؤں گا۔ مگر جب وہ مسکرا کر اور ہاتھ پاؤں پھیلا پھیلا کر میری طرف دیکھتا تو حقارت و نفرت کافور ہو جاتی۔ وہ کتنا پیارا بچہ تھا۔ میری سینکڑوں جانیں اس پر نثار۔! دل چاہتا تھا کہ اسے دیکھتا ہی رہوں۔!

میرا خاندان مختصر سا تھا۔ دادی تھی اس کا نام "لچھمی" تھا۔ ماں تھی جس کا نام "مایا" تھا۔ باپ کا نام "دھنپت" تھا۔ اگرچہ مجھے نکو کہتے تھے، اصلی نام میرا "دولت رام" تھا۔ غرض ہم چھوٹے سے بڑے تک دولت ہی دولت تھے۔ لچھمی، دھن، مایا اور دولت!

دادی ساٹھ برس کی تھی ستّر کی دکھائی دیتی۔ مگر سٹھیائی نہ تھی کام کاج میں بڑی مستعد تھی۔ منہ اندھیرے اُٹھتی، نہاتی، پوجا پاٹ کے بعد گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ میری دیکھ بھال چکی چرخہ چوکا چولہا اسی کے ذمہ تھا ماں شاذ ہی اس کا ہاتھ بٹاتی۔ گھر گرہستی دادی کے سہارے ہی چلتی۔ وہ "مختارِ کُل" تھی۔ باپ اس سے دبتا تھا اور ماں اس سے ڈرتی تھی۔ ساس بہو میں کبھی تکرار ہو جاتی لیکن آئی گئی ہو جاتی۔ دادی کے آبائی رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ اس کے پاس چار دن کاٹ لیتی۔ اور ماں کا میکہ ایسا نہ تھا کہ ایک دن کا سہارا دے سکتا۔ اس لئے لڑ جھگڑ اور رو دھو کر آپ ہی مل بیٹھتیں۔ میں دادی کا لاڈلا تھا کبھی ماں خفا ہوتی تو دادی میری حمایت میں آمادۂ پیکار ہو جاتی۔ اَن پڑھ تھی، پورن بھگت اور راجہ رسالو

کے قصے اسے یاد تھے۔ یہ کہانیاں وہ مزے لے لے کر مجھے سناتی۔ اس کے پاس سو روپے نقد تھے جو ایک تھیلی میں بند رہتے۔ کہتے ہیں اپنی ایک سہیلی نہالی کی امانت میں خیانت کی تھی۔ وہ ان روپوں کو مہینے میں ایک بار ٹھوک بجا کے گن لیتی۔ اور دوبارہ کسی کونے میں دبا دیتی۔ طبیعت کی سخی تھی۔ "ہاتھ کا دیا آڑے آئے" اس کی زبان پر رہتا۔ کھاتے وقت ایک لقمہ کتے، ایک کوے اور ایک گائے کے لئے الگ کر لیتی۔ کوئی منگتا اس کے دروازے سے مایوس نہ جاتا چٹکی بھر آٹا ضرور دے ڈالتی۔ سورج اور پیپل کو جل چڑھانا بھی اس کا معمول تھا۔ منگل کے دن ماں کو ساتھ لے کر ہنومان کے مندر جاتی جو ہمارے گاؤں سے قریباً دو میل پر تھا۔ راستے میں مندروں مسجدوں، ٹھاکر دواروں، گوردواروں اور مزاروں پر سر جھکاتی۔ اور بتاسے چڑھاتی۔ میرے لئے، میرے ماں باپ کے لئے درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنے لئے موت ہی مانگتی۔ اور وہ بھی میرے باپ کی حیات میں۔ مہینے میں ایک دو برت ضرور رکھتی۔ دادی دادا کا ذکر کبھی نہ کرتی۔ باپ کے بچپن کی کہانیاں لوگوں کو سناتی رہتی۔ چالیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی، اس کی زندگی بے داغ تھی۔ اور خیانت کے معاملے کو بہتان بتاتی۔

میرا باپ چالیس برس کا تھا۔ وہ اپنا سلسلہ پراشر رشی سے جوڑے ہوئے تھا۔ اور فخریہ کہتا کہ وید ویاس اور کورو پانڈو سے اسے قرابت حاصل ہے۔ علمی استعداد اتنی تھی کہ نجی خطوط لکھ پڑھ لیتا تھا۔ مذہباً ہندو تھا

چوٹی اور زنّار کا پابند۔ مگر پوجا پاٹ اس کا معمول نہ تھا۔ دھرم شاستر کی سنی سنائی واقفیت تھی۔ ہندو دھرم کی عظمت کی کئی کہانیاں اسے ازبر تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ حضرت محمدؐ کا اصلی نام مہارشی مہامد ہے۔ سنگِ اسود شوجی کا نشان ہے اور حضرت مسیح کشمیری پنڈت تھے۔ ان کی سمادھ (مزار) سرینگر میں ہے۔ اپنی ان معلومات پر نازاں تھا۔ مگر سچ پوچھو تو ہندو سے زیادہ وہ کسان تھا۔ زراعت اس کا پشتینی پیشہ تھا۔ مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے چھ سات ایکڑ زمین تھی اسی میں عزّت کی روٹی کما لیتا۔ اپنے کام سے کام رکھتا۔ جھگڑوں سے دور رہتا۔

میری ماں باپ سے پانچ چھ مہینے چھوٹی تھی۔ صورت شکل میں دو تین سال بڑی معلوم ہوتی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں بیاہی گئی تھی۔ میکے شاذو نادر ہی جاتی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا کہیں جبل پور میں ملازم۔ ماں راکھی ٹیکا ہر سال بھیجتی اور وہ منی آرڈر کے ذریعے دو روپے بھیج دیتا۔ کبھی کبھار خیر خیریت کی چھٹی بھی آجاتی۔ ماں کو ہندی کی شُدبُد تھی بھجن مالا پڑھ لیتی۔ گھر گرہستی میں عمل دخل نہ تھا۔ ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ اور اولادیں بھی ہوئی تھیں مگر زندہ نہ رہیں۔ زندگی کے معمولات بھگو لینے چو کنے ہٹا لینے سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ عصمت مآب اور نیک خاتون تھی ہمسایوں سے اس کے تعلقات خوشگوار تھے۔ ساس یا کسی اور سے جھگڑا ہو جاتا تو ہار مان لیتی۔ وہ ساس کی گرفت میں تھی۔ اسے اولاد کی اموات نے افسردہ دل بنا دیا تھا۔ وہ شراب کے قصے سے دکھی رہتی۔ اکثر کہتی " ہائے

بیکار میرا جنم بھرشٹ (ناپاک) ہو گیا۔"

اس گھرانے میں ہم دونوں بھائیوں نے آنکھ کھولی۔ میرا باپ امیر تو نہ تھا مگر اسے نادار بھی نہ کہا جا سکتا تھا۔ کھانے کے لئے اناج آ جاتا۔ گھر میں گائے تھی۔ دودھ دہی کی کمی نہ تھی۔ ہم چشموں میں نہ پست تھے نہ بلند۔ برائیاں بھی تھیں، بھلائیاں بھی۔ کمزوریاں بھی تھیں اور خوبیاں بھی۔ ہم مقروض نہ تھے۔ چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہ جانتے تھے۔ اور ہماری مستورات اپنے حلقہ میں عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ میرا باپ دادی کی خیانت کو بہتان سمجھتا، اور سر بلند ہو کر چلتا۔ اس کی کئی اولادیں مر چکی تھیں میں "پھڑکن کی اولاد" تھا۔ اس لئے مجھے بہت چاہتا۔ بیوی کی ضروریات کا خیال رکھتا۔ اور دادی کی نظر بچا کر اسے کچھ نہ کچھ دیتا رہتا۔ وہ اپنی ماں کی عزّت کرتا اور اس کے کہنے میں رہتا۔ اس کی دلچسپیوں کا مرکز یا تو اس کا کھیت تھا یا گھر۔ اور کسی چیز سے اسے سروکار نہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا "خدا کا دیا سر پر۔ پاک رہ بیباک رہ" مگر اسے یقین تھا کہ اس کی اولاد صاحب ثروت ہو کر رہے گی۔ اکثر کہتا "خدا زندگی دے! یہ نکو میرا لڑکا ضرور چمکے گا۔"

پانچویں دن میری ماں کا "نہان" ہو گیا۔ دایہ کو دے دلا کر رخصت کر دیا اس کے بعد دادی نے میرے بھائی کا نام "لکھپت" رکھ دیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے دولت پرستی کا دامن نہ چھوڑا۔ اور جہاں تک ناموں کا تعلق ہے ہمارا گھر دولت ہی دولت ہو گیا۔ لوگ ہنسی اڑاتے کہ "بھائی! ان

کے کیا کہنے! نام بڑا اور درشن چھوٹے۔ مولوی صاحب نے تو ایک دن باتوں باتوں میں کہہ ہی دیا "کیوں بھائی دھنپت! سارا دھن خود ہی سمیٹ لوگے۔ ہمارے لئے کچھ تو رہنے دیتے" باپ تو مسکرا دیا مگر دادی کیسے چپ رہتی۔ فوراً بول اٹھی "ہم غریبوں کو کیوں ٹوکتے ہو؟ تم اپنے بیٹے کا نام دولت خاں رکھ لینا۔ تمہیں کون روکتا ہے؟"

تیرھواں، اکیسواں اور چالیسواں نہانے کے بعد سُوتک (ناپاکی) ہمارے گھر سے نکل گیا۔ پانی کے گھڑے بدلے گئے۔ گھر میں گوبر کی لپائی ہوئی۔ دھوپ دان جلایا گیا۔ اور رام نام کا "جَپ" (وظیفہ) کر لیا۔ ماں نے اندر باہر آنا جانا شروع کر دیا۔ لکھپت (لاڈ سے جسے ہم لکھی کہتے) کو گود اٹھا کر میں باہر لے آتا۔ اس سے کھیلتا، اسے کھلاتا۔ مدرسے میں بھی اس کے تصور میں رہتا۔ اور اس کی کوئی ادا یاد آجاتی تو بے اختیار ہنس پڑتا۔ وہ میری دادی کا پوتا نہ تھا۔ میرے ماں باپ کا بیٹا نہ تھا بلکہ "میرا بھائی" تھا جب کوئی کہتا کہ "ننکو" کا بھائی کہاں ہے؟" تو دل باغ باغ ہو جاتا اور میں خوشی سے پھولا نہ سماتا!

ہمارے گاؤں کا نام "گاجی پور" تھا۔ دریائے راوی کے دوسرے کنارے پر آباد تھا جو اب پاکستان کا حصّہ ہے۔ ہمارے مورثِ اعلےٰ مالدیو نے جان پر کھیل کر نہیں بلکہ جان دے کر ایک مغل شاہ زادے کو بچایا تھا۔ اس بہادری اور جانبازی کے صلے میں اسے "غازی" کا خطاب اور اس کے وارثوں کو اچھی خاصی جاگیر مل گئی۔ وہ کلانور سے نقلِ مکان کر کے یہاں

آبسے ۔ غازی کی مناسبت سے پہلے پہل اسے "غازی پور" کہنے لگے ۔ زبان اور زمانہ کے دخل سے بالآخر اس کا نام "گاجی پور" پڑ گیا ۔ جب سے یہی نام چلا آتا ہے ۔ سکھوں کے راج میں تلّی جاٹوں نے ہماری بہت سی زمین چھین جھپٹ لی ۔ جب فریاد واحتجاج کے باوجود کوئی شنوائی نہ ہوئی تو ناچار تھک ہار کر بیٹھ گئے ۔ جو بچ گئی اس کے واحد مالک ہم پراشر ہی چلے آتے ہیں ۔

ہمارے گاؤں کو لوگ "برہمنوں کی بستی" کہتے تھے ۔ حیرت انگیز بات ان سے متعلق یہ تھی کہ اگرچہ پیشے کے لحاظ سے وہ کسان تھے مگر اس کا اثر ان کی "ذات" پر نہ پڑتا تھا ۔ اگر وہ "جفت فروشی" کا دھندا کر لیتے تو بھی برہمن ہی رہتے ۔ اور ان کے تقدس میں کوئی فرق نہ آتا ۔ برعکس اس کے بڑھئی ، کہار ، کمہار ، نائی اگرچہ ذات سے راجپوت رانگھڑ وغیرہ تھے مگر پیشے کی وجہ سے "کمین" کہلاتے اور ذلیل سمجھے جاتے ۔ مہتر (سردار) میگھ (بادل) رمداسیئے (خدا کے غلام) اپنے دلکش ناموں اور ہندو ہونے کے باوجود اچھوت ہی تھے ۔ اگرچہ گاؤں کی اقتصادی زندگی کے معمار یہی لوگ تھے ، مگر زندگی کی کوئی آسانی و آسودگی انہیں نصیب نہ تھی زندگی ان کے لئے وبال تھی ۔ ان کی بستیاں گاؤں کے باہر ایک دوسرے سے الگ تھیں ۔ گاؤں کے مدرسے میں ان کے لڑکے زمین پر الگ بیٹھتے اور دوسروں کے بچے چٹائی پر الگ ۔ دیوی دوارے پر اگرچہ ان کا چڑھاوا (ہدیہ) پروان (قبول) تھا مگر داخلہ بند ۔ کنوئیں ان کی محنت سے

کھودے گئے تھے اور پانی خدا کا انعام واحسان۔ مگر مینڈ پر ان کا چڑھنا بھی گوارا نہ تھا۔ برات گھر ان کے خون پسینے کا کرشمہ تھا۔ مگر انہیں "اندر جانا منع تھا"۔ ہاں ہوا اور دھوپ کھانا اور زمین پر چلنا پھرنا ممنوع نہ تھا۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ ان پر برہمنوں کا حکم نہ چلتا ——— دریا کے کنارے واقع ہونے سے گاؤں کی زمین زرخیز تھی۔ سونا اگلتی تھی۔ آم جامن کی کثرت تھی۔ کنج درکنج گاؤں کو گھیرے ہوئے اور گھروں میں لگے ہوئے تھے۔ بیری اور شہتوت کے درخت بھی تھے۔ کیکر اور شیشم خودرو تھے۔ پیپل اور بڑ کے متبرک پیڑ بھی تھے جن کے تلے گاؤں والے آرام کرتے اور گپ ہانکتے آب وہوا خوشگوار تھی۔ سردیاں نسبتاً سرد ہوتیں اور گرمیاں معتدل۔ بارش کثرت سے ہوتی۔ گاؤں اگرچہ ٹیلے پر تھا۔ پھر بھی اردگرد کھائی کھود رکھی تھی کہ زیرِ آب ہونے سے بچا رہے۔

اگرچہ ہم زراعت پیشہ اقوام میں سے نہ تھے۔ مگر پیشہ ہمارا زراعت ہی تھا۔ ہم گیہوں کثرت سے بوتے تھے۔ مسور، مکئی، چری، چنے، ماش مونگ، موٹھ ضرورت کے مطابق۔ نشیب میں جہاں پانی کی بہتات رہتی دھان بو لیتے۔ گنّے کے ساتھ ساتھ خربوزے بھی ہو جاتے۔ اور ریتلی زمین میں تربوز اور سن کی بھی تھوڑی بہت کاشت کر لیتے۔ مسور ہمارے ہاں کی خاص جنس تھی۔ دور دور تک بطور سوغات جاتی۔ سبزی ترکاری پیاز کی کاشت ذرا گرا ہوا کام سمجھا جاتا۔ یہ چیزیں ساتھ کے گاؤں کوٹلی سے کی کُجریاں آ کر دے جاتیں۔

نمک تیل دیا سلائی اور دیگر اشیاء مہاجن کی دوکان سے مل جاتیں پکوڑے مٹھائی اور دوسری چیزیں پھیری والے (جو گاہے گاہے آتے رہتے) دے جاتے اور ضروریات زندگی کے لئے عام طور پر باہر نہ جانا پڑتا۔ پوشاک کے متعلق کوئی تکلّف یا بناوٹ نہ تھی۔ بچے تو مادرزاد ننگے رہتے۔ سردیوں میں کرتہ ہی غنیمت تھا۔ عورتیں گھروں میں ایک چادر لپیٹے رکھتیں۔ باہر جانا ہوتا تو کرتہ شلوار پہن لیتیں۔ مرد بھی گرمیوں میں آدھے بدن سے ننگے رہتے لنگوٹ یا تہ بند باندھتے۔ سردیوں میں کرتہ اور چادر سے کام چلا لیتے۔ عام طور پر مرد عورتیں اور بچے ننگے پاؤں رہتے۔ بلاتخصیص سب کا رہن سہن اسی ڈھنگ کا تھا۔ مکان کچے تھے مگر کشادہ اور ہوادار، ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ ایک کچا تالاب تھا۔ جس میں عورتیں نہاتیں۔ اور کپڑے دھوتیں۔ ایک جوہڑ بھی تھا جس میں مویشی پانی پیتے۔ گاؤں میں کوئی مذہبی معاشرتی سیاسی جھگڑا انکرار نہ تھا سب اپنے اپنے حال میں مست تھے۔ نہ کسی تبدیلی کے خواہاں نہ کوشاں لوگ مذہبی معاشرتی اور تمدنی اختلافات کے باوجود رواداری، محبت اور خلوص سے رہتے۔ قدرت کی سادہ اور بے تکلّف نعمتوں پر قناعت کرتے اور ان سے لطف اندوز ہوتے۔ موٹا پہنتے اور موٹا جھوٹا کھاتے امیدیں بڑی نہ رکھتے تھے اس لئے مایوسیوں کا بھی سامنا نہ ہوتا تھا۔

جیسے یہ مقولہ

رُکھی مسّی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی   ویکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائیں جی

ہمارے ہی گاؤں کو دیکھ کر کہا گیا ہو۔

ان باتوں کے باوجود گاؤں دیوتاؤں کا نگر نہ تھا۔ اس میں انسان بستے تھے، جن میں کمزوریاں اور خامیاں بھی تھیں، توہمات بھی تھے، بُغض حسد، کینہ بھی۔ ان کے مظاہرے بھی ہوتے رہتے۔ جھوٹ بھی تھا، چوری بھی اور بے راہ روی بھی۔ مگر اس گاؤں میں کوئی ڈاکو پیدا ہوا اور نہ قاتل نہ بدمعاش۔ پولیس شاذ ہی ہمارے گاؤں میں آتی۔ اور وہ بھی سانسیوں کی نگرانی کے سلسلہ میں، جو جرائم پیشہ اقوام میں سے تھے اور رات کا پہرہ دیتے تھے۔

ہم لوگ پٹھانوں اور جاٹوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان سے اچھے مراسم قائم رکھتے اور گزند سے بچے رہتے۔ ہم انہیں خاں صاحب اور سردار صاحب کہہ کر خوش کر لیتے اور اپنے آپ کو پنڈت کہلوا کر مطمئن ہو جاتے۔ تعلیمی طور پر ہم پیش پیش تھے۔ مگر جسمانی طور پر توانا۔ جھگڑا مول نہ لیتے تھے، اگر پلے پڑ جاتا تو ٹال جاتے۔ الحاصل ہم جسمانی طور پر کسان تھے، ذہنی اور اخلاقی طور پر برہمن۔ یہ ماحول تھا جس میں ہمارا نشو ونما ہوا۔ جہاں میرے باپ دادا نے پرورش پائی۔ جہاں ہماری سنی ہواؤں کی سمادھیں تھیں اور ہمارے بزرگوں کی نشانیاں۔ جہاں ہماری عبادت گاہیں تھیں اور ہمارے دھرم استھان۔ جہاں ہمارا راوی بہتا تھا اور جہاں میرے ننھے ننھے بھائی پیوندِ خاک تھے۔

کہتے ہیں زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔ ہمارا گاؤں کولھو کے بیل کے سہارے کھڑا تھا۔ سینکڑوں برس سے ایک ہی ڈھرے پر چلا آرہا تھا۔

چکّی ، چولہا ، توا ، بیلن ، درانتی ، چرخہ ۔ غرض کہ ہر چیز سالہا سال سے یکساں چلی آرہی تھی ۔ ان میں کوئی ترقی ہوئی نہ تبدیلی ۔ زراعت کے طریقے اور اصول بھی وہی تھے جو حضرت آدم سے ورثے میں ملے تھے ۔ ہم کھیت کی سبزی کھاتے تھے اور محنت کے پسینے کی روٹی ۔ اسی پر شاکر و مطمئن تھے ۔ زندگی کا دور پیدائش سے شروع ہوتا ، بیاہ پر ذرا ٹھمتا ، اور موت پر ختم ہو جاتا ۔

زندگی بیل کی طرح کچھ "خرام و مخرام" قسم کی تھی ۔ دن "دال روٹی" سے شروع ہوتا اور "دال روٹی" ہی پر ختم ہو جاتا ۔ پو پھٹتے اٹھتے سورج ڈوبتے سو جاتے ۔ شام کے تین چار بجے چبینا بھی معمول تھا ۔ دودھ دہی مکھن بھی مل جاتا ۔ مگر لسی کی فراوانی رہتی ۔ سردیوں میں سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی لگاتار کئی دن چلتی ۔ مکئی کے بھٹے بھی کھاتے ۔ صبح کو گنے کا رس پیتے اور شام کو گنے چوستے ۔ گنے کا رس کبھی کبھی "رساول" بھی بن جاتا ۔ گاجر ، مولی اور چنے بھی موسم پر میسر ہو جاتے ۔ گرمیوں میں آم جامن کی بہتات رہتی ۔ کچے آموں کا بھرتہ اور چٹنی بھی ہو جاتی ۔ کبھی کبھار بیسنی روٹی ، اچار پیاز پر گذارہ ہو جاتا اور کبھی بیڑھی روٹی دہی پر ۔ کبھی ستو بھی پی لیتے ۔ شرادھ اور اشٹمی کے دنوں میں موج رہتی ۔ حلوا ، کھیر ، آلو ، کچالو ، پکوڑی اور پوری پیٹ بھر کر کھا لیتے ۔ دیوالی بیساکھی خاص تہوار تھے جب مٹھائی بھی مل جاتی ۔ دیوالی خاص اہتمام سے مناتے ۔ گھی کی جوت ساری رات جلتی رہتی ۔ اور لچھمی کے استقبال کے لئے ہم رات بھر کواڑ

کھلے رکھتے۔ مگر موصوفہ نے ادھر کا کبھی رُخ نہ کیا۔ ممکن ہے ہمارے ماحول سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہوں۔!

میرے دن کا آغاز مدرسے سے ہوتا۔ بستر سے اُٹھتے ہی باسی منہ آنکھیں ملتا ادھر کو بھاگتا۔ ان دنوں تعلیم اردو میں ہوتی تھی جو ہم ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان ہے۔ جسے اب نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ہندی گورمکھی بجا طور پر مذہبی زبانیں سمجھی جاتی تھیں۔ مولوی غلام رسول ہمارے مدرس تھے۔ طالبعلموں کی تعداد چالیس کے قریب تھی۔ ان میں ½ دوسرے گاؤں سے آتے تھے۔ تعلیم پانچویں درجہ تک تھی۔ مولوی صاحب اپنے گاؤں بُستان سے گھوڑی پر آتے۔ وہ چارپائی پر بیٹھتے اور ہم چٹائی پر۔ مدرسے میں مختصر سا سامان بھی تھا۔ ایک بلیک بورڈ جس پر املا لکھتے اور سوال حل کرتے۔ ایک کرسی اور ایک میز جو بیکار پڑی رہتیں۔ ایک بوسیدہ ڈسٹر تھا جس سے بورڈ صاف کرتے۔ اور ایک ضلع گورداسپور کا نقشہ تھا جو بوقتِ ضرورت دیوار پر آویزاں کر دیتے۔ وہ پندرہ روپے ماہوار پاتے تھے اور اسی میں ٹھاٹھ سے رہتے۔ وہ جیب دار کُرتہ پاجامہ اور جوتا پہنتے۔ کبھی کبھی تہمد میں بھی آجاتے۔ سر پر رومی ٹوپی رکھتے۔ پٹھان تھے، مگر بڑے حلیم اور شفیق استاد تھے۔ ڈنڈے کا استعمال کم کرتے۔ گالی گلوچ سے اجتناب کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ سے ہی کام نکال لیتے۔ مدرسے کی ابتدا اس حمد سے ہوتی۔ سُنتے اور لہک لہک کر ہاتھ سے تھاپ بھی دیتے:-

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا

مٹی سے بیل بوٹے کیا خوشنما اگائے
پہنا کے سبز خلعت ان کو جواں بنایا

میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے
چکھنے سے جن کے ہم کو شیریں دہاں بنایا

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

سورج سے ہم نے پائی گرمی بھی روشنی بھی
کیا خوب چشمہ تو نے اے مہرباں بنایا

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری انکو تسبیح خواں بنایا

رحمت سے تیری کیا کیا ہیں نعمتیں میسّر
ان نعمتوں کا ہم کو ہے قدرداں بنایا

ہر چیز سے ہے تیری کاریگری ٹپکتی
یہ کارخانہ تو نے کیا رائیگاں بنایا

اس کے بعد درس تدریس کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دوپہر کو آرام کرتے اور سورج ڈوبنے سے پہلے گاؤں کو واپس چلے جاتے۔ ناغہ شاذونادر ہی کرتے خاص خاص موقعوں کے لئے ایک نظم اور بھی تھی جس پر انہیں ناز تھا۔ ان کے ایک شاگرد کی کہی اور ان کی اصلاح کی ہوئی تھی۔ اسے شوق سے سنتے اور والہانہ طور پر، لَے میں لڑکوں کے ساتھ شامل ہو جاتے

تم رام کہو وہ رحیم کہیں دونوں کی غرض اللہ سے ہے
تم دین کہو وہ دھرم کہیں منشا تو اسی کی راہ سے ہے
تم عشق کہو وہ پریم کہیں مطلب تو اسی کی چاہ سے ہے
وہ جوگی ہے تم سالک ہو مقصود دلِ آگاہ سے ہے

کیوں لڑتا ہے مورکھ بندے یہ تیری خام خیالی ہے
ہے پیڑ کی جڑ تو ایک وہی ہر مذہب اس کی ڈالی ہے

بتوا ہو شوالہ یا مسجد، ہے اینٹ وہی چونا ہے وہی!
معمار وہی مزدور وہی مٹی ہے وہی گارا ہے وہی!
تکبیر کا جو کچھ مطلب ہے ناقوس کا بھی منشا ہے وہی!
تم جس کو نمازیں کہتے ہو ہندو کیلئے پوجا ہے وہی!

پھر لڑنے سے کیا حاصل ہے ذی فہم ہو تم نادان نہیں
جو بھائی پر دوڑیں غرّا کر سچ یہ ہے کہ وہ انسان نہیں

کیا جھگڑا دنگا خونریزی تعریف یہی ایمان کی ہے؟
کیا لڑنا مرنا آپس میں تعلیم یہی قرآن کی ہے؟
انصاف کرو تفسیر یہی کیا ویدوں کے فرمان کی ہے؟
کیا سچ مچ یہ خونخواری ہی اصلی خصلت انسان کی ہے!

تم ایسے برے اعمال پہ اپنے کچھ تو خدا سے شرم کرو
پتھر جو بنا رکھا ہے سعید اس دل کو ذرا تو نرم کرو

یہ نظم ان کی اپنی زندگی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ وہ مرنجاں مرنج بزرگ تھے رام، بدھ، نانک کا نام عزت سے لیتے اور کبیر کے دوہے مزے لے لے کر سناتے۔ غرض کہ وہ گاؤں کے لئے رحمت و برکت تھے۔ سب کے دوست، سب کے ہمدرد۔ مدرسے کا نتیجہ ہمیشہ اچھا نکلتا۔ ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا جس میں ہونہار شاگردوں کے نام درج تھے۔ مہینے میں ایک دو بار انکے نام پڑھنے

اور ان کے کارہائے نمایاں اور ثروت کی کہانیاں سناتے اور خوش ہوتے۔

مولوی صاحب "حقے" کا شوق کرتے تھے۔ دن میں ایک دو بار حقہ تازہ کرواتے۔ اور لڑکے اس میں سعادت سمجھتے۔ ایک دن مہاجن کا لڑکا سنتو حقہ تازہ کرنے کے لئے لے گیا۔ اور چلم توڑ لایا۔ مولوی صاحب نے پوچھا تو اس نے شرارتاً حقہ بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا حقہ ٹوٹ گیا وہ نے لیکر بھاگ گیا۔ لڑکوں نے پیچھا کرنا چاہا۔ مولوی صاحب نے روک دیا۔ گاؤں میں بہت چرچا ہوا۔ نمبردار نے مہاجن کو بلا کر فہمائش کی، اور مولوی صاحب سے معافی مانگنے کے لئے کہا۔ اس کا آنا بھی "عذر گناہ بدتر از گناہ" سے کم نہ تھا۔ اُلٹا گلہ کر دیا "حقہ بھرنے کی تمیز نہ تھی۔ گھر میں یہ ذلیل کام نوکر ہی کرتے ہیں۔ بچہ ہے نادان، ہاتھ سے چھوٹ گیا کہو تو نیا لا دوں یا دام بھر دوں؟" مولوی صاحب نے نرمی سے کہا "کوئی بات نہیں، تم نے بیکار آنے کی زحمت اٹھائی۔ سنتو کو مدرسے بھیج دو۔ اسے پڑھائی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔" مگر مہاجن نے اس نیک مشورے پر دھیان نہ دیا اور سنتو واپس نہ آیا۔ اس واقعہ کے بعد مولوی صاحب نے حقہ نوشی ترک کر دی اور اس لت سے نجات پا کر بہت خوش ہوئے۔

مولوی صاحب سے اتر کر دوسری بڑی شخصیت گاؤں میں بسنتی نائن تھی۔ سیاہ فام، بھاری بھر کم ادھیڑ عمر کی تھی۔ سیاپے کی نائن تو تھی ہی مزید برآں گاؤں بھر کی عورتوں کی مشیر و صلاح کار بھی تھی سرمگیں آنکھیں مٹکاتی ادھر لگاتی اُدھر بجھاتی ہر گھر میں اس کا عمل دخل تھا۔ اُس کی

طنزیہ نوک جھوک سے کوئی نہ بچتا۔ پھر بھی ہر دلعزیز تھی۔ ہر جگہ اس کی چلتی
چرب زبان تھی۔ ٹھٹھے مخول سے سب کو خوش کر لیتی اور جہاں جاتی کچھ نے
کر ہی اٹھتی۔

مِتّی نائی اس کا خاوند "راجہ" کہلاتا تھا۔ دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا تھا۔
بہرا اور کم گو۔ یوں تو اس کا کام حجامت بنانا ہی تھا مگر وہ جرّاح بھی تھا۔
حکیم حاذق بھی، وید بھی ڈاکٹر بھی اور عطار بھی۔ سنیاسی ٹوٹکے بھی اسے
از بر تھے اور عمل بھی پڑھ لیتا تھا۔ اوائل میں کسی دوا فروش کا چپڑاسی
رہ چکا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے مطب میں بیٹھتا، حجامتیں بناتا، مرہم پٹی
دوا دارو اور جھاڑ پھونک کیا کرتا۔

لچھمن داس ہمارے گاؤں کا لمبردار تھا۔ گاؤں کے لوگ اُسے
"پنڈت جی" کہتے تھے۔ وہ میرے باپ سے چند سال بڑا تھا۔ گاؤں کی چوتھی
پتی (حصّے) کا تنہا مالک اور گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ سرکار دربار
تک رسائی تھی۔ تحصیلدار ہو یا کوئی اور سب اسی کے یہاں ٹھہرتے۔ مہمان نواز
تھا۔ خدا ترس اور کفایت شعار۔ فضول خرچی کو گناہ سمجھتا، مگر ضرورت مند
سے منہ نہ موڑتا۔ کمین اور اچھوت اسے اپنا سہارا سمجھتے تھے۔ برادری
کے لوگ اپنا مکھیا۔ باہر کے لوگ اس کی عزّت کرتے تھے۔ وہ باشعور
آدمی تھا۔ فارسی اردو ہندی کی شُد بُد رکھتا تھا۔

شوری شاہ مہاجن گاؤں میں نون تیل بزازی اور کرانہ کی دکان کرتا
تھا۔ حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ ہی تھا۔ دوکان اس کی ایک طرح کا تکیہ

تھا۔ ہر وقت خوش گپیاں رہتیں۔ عورتیں آتیں تو ماں بہن کہہ کر اور ان کے بچوں کو میٹھی گولیاں دے کر خوش کر لیتا۔ لڑکوں کو گالیاں بکنا سکھاتا اور ان کے والدین سے متعلق ذومعنی اشارات کر کے ان کا مذاق اڑاتا۔ لوگوں کو خانہ ساز گالیاں دیتا اور بلا تکلف ان کی گالیاں سنتا۔ اور اپنا اُلّو سیدھا کئے جاتا۔ سخت کنجوس ہونے کے باوجود اس کی توند بڑھتی جا رہی تھی خوش رہتا اور لوگوں کو اپنی باتوں میں خوش رکھتا۔ مگر اپنے مطلب کا پکّا تھا۔

ان کے علاوہ کوئی مہمان آجاتا تو وہ بھی ہماری دلچسپی کا باعث بن جاتا۔ بندر، ریچھ اور راس لیلا کے تماشے بھی کافی کشش رکھتے۔ مگر میرے لئے سب سے بڑی کشش "میرا بھائی" تھا۔ وہ اب تین برس کا ہو چکا تھا دوڑ بھاگ لیتا۔ توتلی زبان میں تلکاتا۔ اور دلکش اشاروں سے اپنا دکھ سکھ سُنا دیتا۔ میں اس کا رازدار اور دکھوالا بن گیا تھا۔ وہ میری کتابیں اٹھا لاتا۔ میرے چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔ میرے لڑائی جھگڑوں میں میرا ساتھ دیتا۔ میرے ساتھ روتا میرے ساتھ ہنستا۔ جب زمین پر گر پڑتا اور انتقام لینے کے لئے بے جان زمین کو اپنی کلائیوں سے مارتا تو میں اس کا ساتھ دیتا۔ وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ جاتا۔ اور یہ دکھوں بھری دنیا میرے لئے مسرّتوں کا گہوارہ بن جاتی۔ ہم ایک دم کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ ایک ساتھ ہی کھاتے ایک ساتھ ہی پیتے اور ایک ساتھ سوتے بیٹھتے۔

دوسری نشست

نکو نے کہا "دوست! ہندوؤں نے نہیں! نہیں! برہمنوں نے انسانی تخلیق کو چار حصّوں میں بانٹ رکھا ہے۔ برہمن، چھتری، ویش، شودر پہلے تینوں کو انہوں نے سورن کا نام دے دیا ہے۔ "برہمن" ان سب کا پیشوا ہے۔ وید کا ارشاد ہے کہ "پیدائش سے سب انسان یکساں ہیں نیک اعمال ہی انسان کو برہمن بناتے ہیں" جین دھرم کا مقولہ ہے کہ "خاندانی وجاہت ونسب نہیں بلکہ اعمال ہی اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ انسان برہمن ہے، چھتری ہے، ویش ہے یا شودر۔" اور مہاتما بدھ نے دھما پد میں واضح کر دیا ہے کہ "جو سچّا ہے، پاکباز ہے، جو اپنے ضمیر کو بلند رکھنے کی فکر میں ہے، جو سفلی خواہشات سے بیزار ہے، جو صابر ہے، نفسانی اور فاسد خیالات سے متنفر ہے۔ جو ظلم و استبداد کا تن تنہا مقابلہ کرتا ہے۔ جو کنول کی طرح پانی میں رہ کر پانی سے ملوث نہیں ہوتا۔ جو کسی ذی روح کو ایذا نہیں پہنچاتا جو مغلوب الغضب کے روبرو متحمل ہے۔ جابر کے آگے سلیم الطبع ہے؛ لالچیوں میں رہ کر سخی ہے، جو راستباز اور عبرت پذیر ہے۔ جو دیانتدار ہے، جاہ و حشم کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ وہی "برہمن" ہے"۔ سکھوں کا عقیدہ

ہے کہ "بارگاہِ الہٰی میں ذات نہیں پوچھی جائے گی۔ اعمال ہی دیکھے جائینگے"
ان اقوال سے ظاہر ہے کہ عقاید کے رُو سے درن کا تعلق اعتقاد و پیدائش
سے نہیں بلکہ اعمال و کردار سے ہے۔ کرّۂ ارض کا ہر نیک آدمی "برہمن" ہے
ہر من چلا "چھتری" ہے۔ ہر پورا تولنے والا "ویش" ہے اور ہر فرض شناس
خادم "شودر" ہے۔ اور پھر انسان ہونے کے ناطے میں سب برابر ہیں۔ مگر آج
یہ کیفیت ہے کہ اتفاق سے جو "برہمن" کے گھر پیدا ہو گیا چاہے وہ فاسق و
فاجر ہی کیوں نہ ہو برہمن ہی کہلائے گا اور جو اچھوت کے گھر آگیا چاہے
کتنا ہی نیک کیوں نہ بن جائے تا قیامت "اچھوت" ہی رہے گا برہمن اور
اچھوت کا مقابلہ! میری توبہ! بڑی بے ادبی اور گستاخی سہی مگر علم نوع انسانی
کے رو سے جائزہ لو تو ان دونوں میں کوئی فرق نہ پاؤ گے "جسمانی ساخت
ایک سی ہے بلکہ خون نطفہ اور فضلہ میں کوئی تفاوت نہیں۔ شکل و صورت
میں بھی کوئی نمایاں اختلاف دکھائی نہیں دیتا جسم کی رنگت کا بھی یہی
حال ہے۔ "برہمن" گورے بھی ہیں، سانولے بھی اور کالے بھی علیٰ ہذا لقیاس
اچھوت بھی۔ ذہنی اور اخلاقی طور پر بھی اچھوت کا درجہ کم نہیں، نندنار،
روی داس چوکھا میلا اچھوت ہوتے ہوئے بھی برگزیدہ تھے۔ ہزاروں نہیں
لاکھوں ہندو ان کے عقیدتمند چلے آتے ہیں۔

آریہ جب ہندوستان میں آئے تو "خانہ بدوش" تھے۔ مویشی ہی ان کی
دولت تھے۔ اور وہ اس دولت کی حفاظت کے لیے چراگاہوں میں ان
کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ جب کاشت شروع کر دی تو ان کی دولت زمین

میں منتقل ہوگئی اور مویشیوں کی حیثیت ثانوی رہ گئی ۔ وہ زمین اور اس کی
پیداوار کی حفاظت کے لئے جم کر ایک جگہ بیٹھ گئے ۔ اور بستیاں آباد کرلیں۔
مفتوح اقوام کو انہوں نے "آورن" کا نام دے دیا۔ ہمارے گاؤں کے
اچھوت ، انہی کی اولاد ہیں جنہیں صاحب اقتدار نافہم اور غیر منصف مزاج
سماج نے [illegible] دھتکار دیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یونانی،
ساکا، جینو، ہون اور دیگر فاتح اقوام کو تو ہندوؤں نے اپنے اندر جذب کر
لیا مگر مفتوحوں سے ایسا سلوک روا رکھا کہ توبہ ہی بھلی۔ ان کی خودداری کو
پامال کر دیا اور انہیں اچھوت قرار دے دیا۔

ہندوؤں میں ناپاکی تین طرح کی بیان کی جاتی ہے۔ کپڑوں سے ہونا،
جنم مرن اور اچھوت سے چھو جانا۔ یہ ناپاکی پانی یا گنگا جل کے چھینٹے دینے یا
نہانے سے دور ہو جاتی ہے مگر اچھوت پر اس عمل کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ بدبخت
اچھوت! تاقیامت اچھوت ہی رہے گا۔ مگر یہ کہ وہ چوٹی کٹا کر کوئی دوسرا
مذہب اختیار کر لے!

دریائے راوی کا یہ معمول ہے کہ طغیانی میں وہ اپنا رُخ بدل لیتا ہے
ہمارے گاؤں سے ایک میل پرے سیلاب سے ایک گاؤں بہہ گیا میلوں تک
پانی پھیل گیا۔ ہمارا گاؤں بھی زد میں آیا۔ اچھوتوں کے گھروں میں پانی آگیا۔
اور ہمارے کنوئیں زیر آب ہو گئے۔ صرف ایک بچا جو زیادہ اونچائی پر تھا
یہ قہر الٰہی تھا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ فصلیں بھی تباہ ہوگئیں اور آمدورفت
کے راستے مسدود ہو گئے۔ اچھوتوں کا برا حال تھا ان کے بچے بلک رہے

تھے۔ فریادی ہوکر لمبردار کے پاس گئے۔ اس نے فراخدلی سے دس من گندم ان میں بانٹ دیا۔ پینے کے پانی کی دقت تھی۔ اس کا بھی تدارک چاہا مگر لمبردار اس سے متعلق کوئی خاطرخواہ انتظام نہ کرسکا۔ سردست معذوری کا اظہار کیا مگر وعدہ کر دیا کہ اچھوتوں کے کنوئیں کی منڈیریں اونچی کروا دے گا۔ لمبردار نے شاملاتِ دیہہ کی آمدنی سے منڈیریں اونچی کروا دیں۔ کھائی کو کشادہ اور گہرا کروا کر اچھوتوں کی بستی کو گھیرے میں لے لیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اور گاؤں آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔ نائن کو لمبردار کی سخاوت پسند نہ آئی۔ گھر گھر کہتی پھرتی کہ نقصان تو کچھ ہؤا نہ تھا، موذیوں نے مفت میں مال اینٹھ لیا۔ شوری مہاجن بھی ناخوش تھا۔ اس مصیبت میں ہاتھ رنگنا چاہتا تھا۔ اس کے پلے بھی کچھ نہ پڑا" دانا دان کرے بھنڈاری کا پیٹ پھوٹے۔" ایسے بھی تھے جنھیں لمبردار کی سخاوت بُری لگی۔ بعض نے تو برملا کہہ دیا۔ "غریب بھائی بھوکے مر رہے ہیں، اچھوتوں کو مالامال کر دیا۔ ادھر بھی دیکھ لیا ہوتا" غرض نفرت حقارت اور منافقت کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور یہ لوگ اسے ہوا دیتے رہے

نائن کا لڑکا اجیت اور مہاجن کا لڑکا سنتو چند ہمجولیوں کے ساتھ باہر جا رہے تھے کہ سامنے سے مہتروں کا لڑکا ہل لئے مل گیا۔ وہ ڈر کر ایک طرف ہوگیا مگر بیلوں کو سنبھالتے سنبھالتے ان میں سے ایک کے ساتھ چھو گیا۔ پھر کیا تھا انھوں نے اسے خوب مارا اور اس کے منہ پر تھوک دیا وہ بیچارہ جان بچا کر اپنی بستی کی طرف بھاگا۔ لڑکوں نے بیل کھول دئے

اور ہل توڑ دیا۔ یہ ٹولی خرمستیاں کرتی اور گالیاں بکتی ان کے کنوئیں کے پاس پہونچی تو مینڈ پر چڑھ کر دائرہ بنالیا اور ایک دو تین کی گردان کر کے کنوئیں میں موت دیا۔ اتنے میں مہتر بھی باہر نکل آئے۔ للکارا تو لڑکے بھاگ گئے۔ گالیاں کھانے اور پٹنے کے تو وہ عادی تھے ہی مگر یہ "تھوکنا اور موتنا" ان کے لئے نئی باتیں تھیں۔ وہ شاید یہ بھی سہہ جاتے مگر ان کے ہاں نارووال سے ایک مہمان آیا ہوا تھا۔ اسے غصّہ آ گیا۔ اس نے تھانے میں رپٹ لکھوانے کے لئے اکسایا مگر وہ نہ مانے۔ جھگڑا بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور لمبردار کے پاس چلے گئے۔ وہ باہر گیا ہوا تھا۔ انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ اس اثنا میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لمبردار آیا تو ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔ مہتروں نے واویلا مچایا۔ لمبردار نے شکایت غور سے سنی لڑکوں کو برا بھلا کہا اور مہتروں کو تسلی آمیز الفاظ میں یقین دلایا کہ "خاطر جمع رکھو، لڑکوں کی وہ خبر لوں گا کہ یاد رکھیں گے۔ فی الحال تمہارے لئے رہٹ چلتا رہے گا۔ پانی وہاں سے لے لینا۔ ہل چھوڑ جاؤ مرمت کروا دوں گا۔ کنوئیں سے متعلق سوچ کر بتاؤں گا۔" مضروب لڑکے کو روپیہ دے کر کہا "بیٹا یہ لو گھی کھا لینا"۔

لمبردار یہ معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھا کر زنان خانہ میں گیا تو بیوی بے طرح برس پڑی کہ "مہتروں کو بیکار سر پر چڑھا رکھا ہے۔ مفت کی بدنامی مول لے رہے ہو۔ تجھے لمحہ بھر بھی چین نہیں لینے دیتے۔ تیری شہ پر اکڑ رہے ہیں۔ لڑکوں کو چھو دیا، بیچاروں کو بے وقت نہانا پڑا۔ اور کپڑے دھونے

پڑے۔ نہ پیٹتے تو کیا کرتے ؛ تیری طرح بٹیا بنا کر چوم لیتے ؟"

لمبردار نے نرمی سے کہا "اور مُوت کی بات کیا ہوئی ؟"

"کیا بات ہوئی ؟ ہمارا رمیش تھالی میں نہ مُوت دیا کرتا تھا"؟ لمبردارنی بولی

لمبردار نے آزردہ ہو کر کہا "مگر یہ لڑکے تو غیر ہیں۔ ان کے اپنے لڑکے تو نہ تھے !"

"ان کے لڑکوں کے سر پر خاک ! پھر کیا ہوا ؟ کل منو کہاری آئی تھی، میں نے اس کی لڑکی اٹھالی۔ اس نے مُوت دیا۔ کیا وہ میری اپنی لڑکی تھی۔ !"

لمبردارنی چلّائی

لمبردار نے کہا "گرم ہونے کی بات نہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ لے۔ کپڑوں پر موتنے اور کنوئیں میں موتنے میں کتنا فرق ہوا کرتا ہے !"

"سوچ لیا۔ خاک فرق ہوتا ہے۔ تجھے تو وکیل ہونا چاہیئے تھا۔ بیکار لمبردار بن گیا۔ تجھے اپنے تو بُرے لگتے ہیں اور پرائے اچھے۔ چھجو پراشر کا لڑکا بھی اہلیں میں تھا۔ کپڑے دھونے پڑے۔ بیچارہ ننگ منگ پھر رہا تھا شرم نہ آئی تجھے مہنر کو بیٹا کہتے ؟" یہ کہہ کر لمبردارنی باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد لمبردارنی پھر آئی تو لمبردار نے کہا "تو سچ کہتی ہے ذرا میری بھی تو سُن لے"۔ لمبردارنی رک گئی تو لمبردار نے کہا "بھاگوان ! میں ناکارہ آدمی ہوں۔ مجھ سے کھیتی باڑی نہیں ہوتی نہ میں ہل چلا سکتا ہوں نہ ہمارا رمیش۔" لمبردارنی نے بات کاٹ کر کہا "ہل چلائیں رمیش کے جوتے۔ وہ کیوں چلائے"۔ لمبردار نے کہا "اچھا یوں ہی سہی۔ میں ہل چلا نہیں سکتا

یہ محنت مجھ سے ہو نہیں سکتی اور رمیش بھی نہیں چلا سکتا۔ اور تیرے کہنے کے مطابق اگر چلائیں تو اس کے جوتے۔ پھر فصل کہاں سے آئے گی؟ اور ہم کھائیں گے کیا؟ برادری کے آدمیوں کو کاشت کے لئے زمین دی تھی۔ تجھے معلوم ہی ہے کیا حشر ہوا؟ رمدا سئے اور سنگھ بھی کچھ بہتر ثابت نہیں ہوئے۔ ناچار زمین مہتروں ہی کو دینی پڑی۔ تو دیکھ رہی ہے کہ ہمارا گھر بھر گیا ہے۔ وہ محنتی اور جفاکش ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے بار بار ہل چلاتے ہیں۔ کھات ان کے پاس بہتات سے ہوتی ہے بیل ان کے توانا ہوتے ہیں۔ عورتیں زراعت میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ تاش شطرنج کی انہیں لت نہیں۔ اگر تنگ آکر وہ گاؤں چھوڑ جائیں تو ہمیں رمیش کے جوتوں سے خاک دھول کے سوا اور کیا ملے گا؟ گھر کا کارخانہ کیونکر چلے گا؟ ہم کھاتے پیتے ہیں، لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ اگر مہتر دل برداشتہ ہو کر چلے جائیں تو ہمارا دھندا بگڑ جائے گا۔ آخر رمیش کے جوتے تو ہل نہ چلا سکیں گے۔ آدمی ہی رکھنے پڑیں گے تو تجھ دار ہے۔ آدمیوں کا انتظام کر دے تیری بات پر ابھی پھول چڑھا دیتا ہوں۔

لمبردارنی گہری سوچ میں غرق ہو گئی جواب بن نہ پڑا تو اٹھ کر چلی گئی

گاؤں سے دو میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ تھا "دودھا" مکان اور سڑکیں اس کی پختہ تھیں۔ مڈل اسکول، ڈاکخانہ، بزازی کرانہ اناج مٹھائی کی دکانیں اور شراب کا ٹھیکہ بھی تھا۔ ایک ودوان (عالم) پنڈت گنگا دھر وہاں رہتے تھے۔ پوجا پاٹ کے آدمی تھے۔ مہاجنوں کے سہارے ان کی اچھی گزران

ہو رہی تھی لمبر دار سے بھی جان پہچان تھی بشورے کے لیئے دوسرے دن لمبر داران کے پاس پہنچا اور ساری کہانی کہہ سنائی۔ اور کنوئیں کی شُدھی کے لیئے پوتر گنگا جل مانگا۔ مجلس جمی ہوئی تھی کچھ دیر تو پنڈت جی خاموش اُدھر اُدھر جھانکتے رہے۔ پھر دفعتہً جلال میں آ گئے اور فرمایا "مورکھ! جو پیدائشی ناپاک ہو، تم کس باغ کی مولی ہو، اسے تو برہما (خالق) بھی پاک نہیں کر سکتے۔ ناپاک رہنا ہی اس کا سبھاؤ (خصلت) ہے۔ وہ خود ناپاک ہے چیزیں جو اس سے ظہور میں آئیں وہ بھی ناپاک ہو گئیں۔ گنگا جل ان کے لیئے نہیں بنا تھا۔ مورکھ! ذرا سوچ! بھاگیرتھی نے سینکڑوں برس ریاضت کی تو کہیں وشنو کے پاؤں تلے سے گنگا کو نکالا۔ پھر سینکڑوں برس کی تپسیا (بندگی) کے بعد شِوجی بہاؤ کو اپنی جٹا میں سمیٹنے پر رضامند ہوئے۔ پھر برسوں کی منت داری کے بعد انہوں نے گنگا کو زمین پر چھوڑا۔ ان مشکلوں کے بعد گنگا کا ظہور دھرتی پر ہوا۔ کیا اتنا دکھ، اتنی تکلیف، اتنی زحمت بھاگیرتھ نے تمہارے گاؤں کے مہتروں کے لیئے اٹھائی تھی؟ مورکھ سنسار (دنیا) برہمن کی کھیتی ہے برہمن کے گھر جنم لے کر یہ بھی نہ جانا کہ برہمن پوترتا (پاکیزگی) کا روپ (مجسمہ) ہے۔ اگر اپوترتا (ناپاکی) سے لگ کر کسی وقت اپوتر (ناپاک) ہو جائے تو گنگا جل اس کا تشیدھ (روک) ہے۔ مہتر اپوترتا (ناپاکی) ہے۔ اس سے جو بھی چھو جائے گا ناپاک ہو جائے گا۔ مہتروں کے کنوئیں کا پانی پہلے ہی اپوتر ہے۔ اگر کوئی اپوتر (ناپاک) چیز اس میں پڑ گئی تو

اندھیر ہو گیا۔ ! گنگا جل ان کے لئے نہیں ہے۔ یہ نشچہ جان (مان لے) یہی ہماری بیوستھا (فتوے) ہے۔

لمبردار نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج بجا ہے مگر کوئی اور علاج بتایئے ورنہ مہتر گاؤں چھوڑ جائیں گے اور زمینداری بگڑ جائے گی"۔ پنڈت جی نے گرم ہو کر کہا "کس مورکھ سے پالا پڑا ہے۔ تمہیں پھر اور کیا چاہیئے۔ تمہاری دھرتی اپوتر ہونے سے بچی"۔ سامعین پنڈت جی کے استدلال سے اتنے متاثر ہوئے کہ بے اختیار ان کے منہ سے یہ نعرۂ تحسین نکل گیا بلہاری (صدقے) جایئے ! گنگا میّا تیری سدا ہی جے" اور پھر کمرے میں سکوت چھا گیا۔ لمبردار دل برداشتہ ہو کر واپس آ گیا۔ راستہ بھر سوچتا رہا مگر وہ اس الجھن کا کوئی حل نہ ڈھونڈ سکا مہتروں کے چلے جانے میں اسے اپنی زمینداری کی بربادی دکھائی دیتی تھی۔ نئے مزارع ڈھونڈنا بھی آسان نہ تھا۔ واپس آیا تو پولس انتظار میں تھی۔ گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ نارووال والے مہمان نے پولس میں رپٹ لکھوا دی تھی چھوٹا تھانیدار چند سپاہی لے کر تفتیش کے لئے آیا ہوا تھا۔ اور لمبردار کے انتظار میں تھا۔ پولس ساتھ کے گاؤں کے معززین کو بھی لائی ہوئی تھی۔ لمبردار نے انہیں برات گھر میں ٹھہرایا۔ مناسب رسد بھیج دی اور واقعات کی تفصیل بلاکم و کاست بیان کر دی۔ پولس نے شوری سے پوچھا تو رونی صورت بنا کر اس نے کہا "باپ کرے باپ پائے بیٹا کرے بیٹا پائے۔ میں کیا جانوں ؟ کل سے کھیل بھی اڑ کر منہ میں

نہیں پڑی۔ رونا تو یہ ہے کہ لڑکا ہی غائب ہے میرے پر ماتما! میں کہاں جاؤں؟" نائن نے ایک جیجیم دھاڑ مچا رکھی تھی۔ بولی "کھیتی رکھے باڑ کو باڑ رکھے کھیتی کو۔ مگر یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ چوہا بلی کا شکار ہے۔ ہم غریبوں کی جان پر بن رہی ہے۔ لڑکا ملتا ہی نہیں، راجہ بیچارہ مارا مارا پھر رہا ہے" اور چھاتی پیٹ کر کہا "ہائے میں کہاں ڈھونڈوں۔! ہائے میں کیا کروں۔"
لمبردار نے مضروب کے باپ کو مخاطب کر کے کہا "ہل تیرا مرمت ہو گیا۔ دالان میں پڑا ہے، اٹھا لے! لڑکے کو چوٹیں آئیں۔ بڑا افسوس ہے۔ روپیہ پہلے لے چکے ہو، اٹھنی اور لو۔ اب تیرا کیا جھگڑا رہا کہ پولس کو لے آئے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں نہیں لایا۔ پولس آپ سے آپ آ گئی۔ ہمارے کنوئیں میں موت دیا۔ اس کا کیا علاج؟"

معززین میں سے ایک نے ہنس کر کہا "لال دوائی ڈال دینا۔ کنواں صاف ہو جائے گا اور کیا چاہتے ہو۔؟"

معززین نے زور ڈالا۔ نیک چلنی کا یقین دلایا اور فریقین میں صلح کرا دی جاتے جاتے چھوٹے تھانیدار نے گرج کر ٹھک کر کہا "اگر آیندہ شرارت کی تو خیر نہیں، رعایت نہ ہو گی۔ سارے گاؤں کو باندھ لوں گا۔"

بیساکھی نوروز کا دن ہوتا ہے مگر کسان کے لئے روزِ سعید بھی ہے لہلہاتے کھیت اس کے پژمردہ چہرے کو شگفتہ۔ ارمانوں کو شاداب اور حوصلوں کو بلند کر دیتے ہیں۔ میلے ٹھیلے کی رونق رہتی ہے مگر ہمارے

لئے تو یہ خاص خوشی کا دن تھا۔ لکھی کو آج مدرسے میں داخل ہونا تھا۔
میں بارہ برس کا ہوگیا تھا اور پانچویں میں تھا۔ لکھی پانچ برس کا تھا
اور کچی پہلی میں آرہا تھا۔ ہم جلوس بنا کر گھر سے نکلے۔ دادی کے ہاتھ میں
ٹوکری تھی جس میں پگڑی، گڑ کی بھیلیاں اور دو روپے نقد رکھے ہوئے
تھے۔ لکھی سفید کرتہ اور جانگھیا پہنے ساتھ ساتھ آرہا تھا۔ میں اپنے
جزدان کے علاوہ لکھی کی سلیٹ تختی اور قاعدہ اٹھائے ہوئے تھا۔ باپ
میرے پیچھے پیچھے تھا۔ اور ماں سب سے پیچھے گھونگٹ نکالے رینگتی چلی
آرہی تھی۔ مدرسہ شروع ہو چکا تھا۔ حمد کے اشعار گائے جا چکے تھے۔
باپ مولوی صاحب کی پائینتی بیٹھ گیا اور میں اپنی جگہ پر ہو لیا۔ دادی نے
بڑھ کر ٹوکری مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دی اور لکھی نے اپنا سر
ان کے قدموں میں جھکا دیا۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر
ہاتھ رکھا۔ ایک بھیلی دادی کو واپس دے دی اور اس کے بعد سب لوٹ
آئے۔ مولوی صاحب نے دو بھیلیاں توڑیں اور مجھے بلا کر کہا "لو ننکو!
انہیں بانٹ دو۔ اور سب کا منہ میٹھا کرا دو۔" بعد کو لکھی کو بلایا۔ وہ لجاتا
شرماتا مسکراتا مولوی صاحب کی گود میں آبیٹھا۔ انہوں نے لڑکوں کو
مخاطب کر کے کہا " دیکھو بچو! یہ لڑکا مدرسے میں آج داخل ہوا ہے
کتنے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اس کا چہرہ کتنا کھلا ہوا
ہے۔ بال سلجھے ہوئے ہیں۔ ناخن صاف اور ترشے ہوئے ہیں۔ تم
بھی اس کی طرح ستھرے رہ سکتے ہو۔ اس میں دام نہیں لگتے۔ عزت

سے رہو، ذلت سے بچو، ماں باپ اور استاد کی خدمت کرو۔ اپنے اپنے
مذہب کے مطابق اپنی زندگی کو پاک و صاف رکھو۔ دیس کی آبادی و بربادی
کا انحصار تم میں سے ہر ایک کے اپنے کیے دھرے پر ہے۔ اچھے کام سے
تم اپنا، اپنے باپ دادا کا اور میرا نام روشن کر سکتے ہو۔ بچو! چوکے چولہے
کنویں تالاب میں موت دینا یا غلاظت پھیلانا بری باتیں ہیں۔ اس سے بیماری
پھیلے گی۔ اور ہم تم سب اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ تم میں سے بعض نے
یہ کام کیا ہے۔ بہت برا کام کیا ہے۔ ایک طرح سے پولس کو دعوت دی
ہے۔ پولس کا آنا اچھا نہیں۔ گاؤں بدنام ہو جائے گا اور تم اپنے باپ دادا
کو رسوا کر دو گے۔"

لڑکے خاموش رہے مگر جنہوں نے یہ خرابی کی تھی ان کی نگاہیں نیچی ہو
گئیں۔ اور سب لڑکے حقارت سے ان کی طرف تکنے لگے۔ اپنے بھائی سے
متعلق تعریفی کلمات سن کر میں جامے میں پھولا نہ سمایا۔ اور جب بیساکھی کی تقریب
میں مدرسہ قبل دوپہر بند ہو گیا تو میں تحمی کو کندھوں پر اٹھا کر گھر لے آیا۔ خدا
کی قسم میرا ننھا منا بھائی پہلے ہی دن مدرسے کا ہیرو بن چکا تھا۔

میرا باپ خوشی کی ترنگ میں تھا وہ ہمیں میلہ دکھانے کے لئے اپنے
ساتھ لے گیا۔ "میرا بھائی" ہمارے ساتھ ساتھ دوڑا جا رہا تھا۔ گاؤں سے
نکلتے ہی میلے کے آثار نظر آنے لگے۔ اطراف سے لوگ جوق در جوق موضع
دودھا کی طرف جا رہے تھے۔ پیدل بھی، گھوڑ چڑھے بھی۔ گاڑی پر لدے ہوئے
بھی۔ ان میں ہر عمر، ہر قماش، ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے

لکشمی تھک جاتا تو کبھی میں اٹھا لیتا اور کبھی باپ۔ غرض کہ ہنستے کھیلتے ہم دو ڈھائی ہو پہنچ گئے۔ میلہ رونق پر تھا۔ انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ لوگ شربت اور لسّی کی سبیلیں پلا رہے تھے۔ اور راہ چلتوں کو پکڑ پکڑ کر دعوت دے رہے تھے۔ گہما گہمی، دھکم دھکا تھا۔ باپ نے لکشمی کو کندھے پر اٹھا لیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ بھیڑ میں کہیں گم نہ ہو جاؤں۔! دوکانیں سجی ہوئی تھیں کہیں پکوڑے تلے جا رہے تھے۔ کہیں جلیبیاں بنائی جا رہی تھیں۔ کہیں مٹھائی کی دوکانیں تھیں۔ جہاں تہاں پیڑے گلاب جامن رنگا رنگ کی برفی بک رہی تھی۔ کہیں مصری کی دوکانیں تھیں۔ کہیں بتاشے اور طرح طرح کے کھانڈ کے کھلونے بن رہے تھے۔ مٹی اور لکڑی کے کھلونوں کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کہیں ہنڈولے چل رہے تھے۔ کہیں نٹ بدیا کی نمائش تھی۔ کہیں بندروں اور ریچھوں کا تماشا ہو رہا تھا۔ کہیں بازیگر اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ کہیں مگدر اٹھانے کا مقابلہ تھا۔ کہیں بھانڈ ٹھٹھے مخول کی باتوں سے لوگوں کا دل بہلا رہے تھے کہیں ہارمونیم پر گانا ہو رہا تھا۔ کہیں بازاری دوا فروش مجمع لگائے کھڑے تھے۔ کہیں پٹے کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ غرض کہ ہم نے اتنا کچھ دیکھا کہ بیان سے باہر ہے یہ مناظر بہت دلکش اور دلچسپ تھے۔ میں نے اور لکشمی نے جھولا جھولا، کھلونے خریدے اور جی بھر کر سیر کی۔ باپ نے جلیبیاں اور پکوڑے خریدے۔ اور ہم نے پیٹ بھر کر کھائے۔ سستانے کے لئے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اور ڈھول کے تال پر بھنگڑا ناچ کا راگ رنگ

دیکھتے رہے۔ اب شام ہونے کو تھی اور میلہ چھٹنے لگا۔ باپ نے گھر کے لئے جلیبیاں اور پکوڑے خریدے اور ہم گھر کو واپس چل پڑے۔ راستے میں ہمیں گاؤں کے اور لوگ بھی مل گئے۔ خوش گپیوں میں وقت ہی نہیں معلوم ہوا۔ جھٹ سے گاؤں پہونچ گئے۔ دادی انتظار میں کھڑی تھی۔ ان نے لکھی کو گود میں لے لیا۔ باپ نے مٹھائی دادی کو دے دی۔ اس نے ایک پکوڑا اور ایک جلیبی تو اپنے لئے رکھ لی اور دو جلیبیاں اور دو پکوڑے ماں کو دے دئے۔ باقی مٹھائی سینت کر رکھ دی اور کئی دن ہمیں کھلاتی رہی۔ دادی رات گئے تک میلے کا حال کبھی لکھی سے اور کبھی مجھ سے سنتی رہی۔ ہم تھکے ماندے تو تھے ہی باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

دوسرے دن مدرسے پہنچے تو مولوی صاحب نے لکھی کو اپنے پاس بلایا۔ اس کو صاف ستھرا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بسم اللہ کہہ کر ا۔ ب۔ پ کا درس دیا۔ یہ لکھی کی تعلیم کی ابتداء تھی ایک نیک معلم کے ہاتھوں۔

میں جماعت میں اچھا تھا۔ چوتھی میں اوّل رہا تھا مولوی صاحب پچھلے پہر جماعت سے الگ کچھ وقت دے دیا کرتے تھے جس میں وہ روز کا سبق سُن لیتے۔ اور حساب کا نیا قاعدہ ذہن نشین کرا دیتے۔ بڑے نیک اندیش اُستاد تھے۔ ایک دن فرمایا "بیٹا تم اچھے لڑکے ہو۔ محنتی اور ذہین۔ یہ خوبیاں اکٹھی ہو جائیں تو زندگی سپھل ہو جاتی ہے۔ یہ سال تمہارے لئے ایک اہم سال ہے۔ وقت ضائع نہ ہونے پائے ورنہ سارا

کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔ کام میں دل لگاؤ۔ محنت کرو، اگر وظیفہ مل گیا تو خاندان بن جائے گا۔ تم لکھی کو اعلےٰ تعلیم دلا سکو گے۔ اچھے گھر میں بیاہے جاؤ گے اور میں تمہارا نام اپنے رجسٹر میں درج کرلوں گا۔ یہ دل بڑھانے والے کلمات میرے لئے کوئی کشش نہ رکھتے تھے۔ وظیفے کی اہمیت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ وقت کی قدر یا بے قدری کا مجھے کوئی احساس نہ تھا۔ نہ خاندان کی بلندی یا پستی کا فکر۔ نہ شادی کی تمنّا یا خوشی۔ نہ رجسٹر میں نام لکھوانے کا شوق۔ مگر یہ الفاظ کہ "لکھی کو اعلیٰ تعلیم دلا سکو گے" معلوم نہیں کیوں اور کیسے دل میں بیٹھ گئے۔ میں نے پکّا ارادہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو" وظیفہ لے کر چھوڑوں گا اور شفیق استاد کی توقعات کے مطابق لکھی کو ضرور اعلےٰ تعلیم دلا دوں گا۔" میں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ مگر دو تین آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ وہ میرے احساسات سے واقف ہو کر خاموش ہو گئے۔ اور اس کے بعد اگرچہ انہماک اور سرگرمی سے مجھے پڑھاتے رہے اور میرے کاموں سے مطمئن بھی تھے۔ مگر لکھی سے متعلق کوئی لفظ ان کی زبان سے پھر نہ نکلا۔ البتّہ میرے متعلق باپ سے یہ ضرور کہتے " دیکھو بھائی دھنپت! نکو بہت محنت کرتا ہے اسے مکھن دہی دیتے رہنا۔ ہلکے ہاتھوں بدن پر تیل مل دینا۔ بھولنا نہیں" دُلّی" نائی بہرا ہشتی تو تھا ہی، لوگ اسے کراماتی اور منتری بھی سمجھتے تھے اور اس کے کشف و کرامات سے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں وہ نبض کو چھوئے بغیر بیماری کی تشخیص کرلیتا تھا۔ جھاڑ دکے اشارے

سے آسیب کا دخل دور کر دیتا تھا۔ مٹی کی چٹکی سے شفا بخش دیتا تھا۔ ناگ
اس کے حضور دم بخود کھڑے رہتے۔ موت پر بھی اسے قابو تھا۔ کہتے ہیں تو پر اشر
کالر کا زمیندار چلچلاتی دھوپ میں مسانوں کے پاس سے گذرا تو دبوچا گیا۔
چار قدم بھی نہ اُٹھا سکا۔ لاش اٹھا کر دتی نائی کی دکان پر لے آئے۔ اس
نے دم کر کے تازہ پانی کے دو چھینٹے دئے تو وہ رام رام کہتا اٹھ بیٹھا۔ یہ اور
ایسی کہانیاں اس سے متعلق لوگوں کی زبان پر چڑھی ہوئی تھیں۔

سیلاب کے باعث گاؤں میں سانپوں کی کثرت ہو گئی تھی۔ سانپ مارنے
سے برہمن کو پاپ لگتا ہے۔ اور پاپ سے زیادہ ڈسنے کا اندیشہ بھی تھا کہ موت
ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ کام بھی مہتروں کے سپرد تھا۔ ہیرے مہتر کے لڑکے
خزانچی کو سانپ نے ڈس لیا۔ سانپ دیکھتے دیکھتے ہی غائب ہو گیا۔ یہ خبر آناً فاناً
گاؤں میں پھیل گئی اور دتی تک جا پہنچی۔ اس نے کوٹھڑی سے پٹارا نکالا اور
ایک سانپ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں خزانچی کو اٹھا کر دتی کی دکان
پر لے آئے۔ دتی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور اپنا شغل جاری رکھا۔
خزانچی نے سانپ کو دیکھا تو خوف سے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور ہانپتے کانپتے
کہا "ڈسنے والا سانپ یہی تو ہے"۔ دتی نے معنی خیز نگاہوں سے خزانچی
کی طرف دیکھا اور سانپ کو پٹارے میں بند کر کے یہ کہتا ہوا کہ "ابھی
آتا ہوں" چلتا بنا۔ سارا دن غائب رہا۔ شام کو واپس آیا تو لڑکا دم توڑ
چکا تھا۔ ہیرے نے سنا تو بھاگا آیا کہ خدارا کچھ کرو، عمر بھر احسان مند رہوں
گا۔ مگر نائن نے کواڑ نہ کھولا۔ اور کہہ دیا کہ "اپنی کرے یا پرائی، اس کا تو

اپنا ستیاناس ہو گیا ہے۔ سانپوں کی دشمنی کا شکار ہے۔ پرماتما! ہمارا کیا بنے گا۔" جوانا مرگ چھوٹی بات نہ تھی۔ مہترانیوں نے پیٹ پیٹ کر اپنی چھاتیاں نیلی کر لیں۔ اور کئی دن کام پر نہ آئیں۔

چھوٹے تھانیدار کا یہ کہنا کہ "آئندہ شرارت کی تو خیر نہیں" گاؤں والوں کو پسند نہ آیا۔ اس سے پہلے مہتروں کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔ مہتروں کی خاطر "سارے گاؤں کو باندھ لینا" ایک نئی اور انوکھی بات تھی مجموعی تو نہیں انفرادی طور پر بہت سے لوگ مہتروں کے خلاف ہو گئے۔ اور کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا "لمبردار چونکہ خود ناکارہ ہے اس لئے اس نے مہتروں کو سر چڑھا رکھا ہے"۔ نائن کے زیر اثر عورتیں بھی مہتروں مہترانیوں سے رکھائی سے پیش آتیں۔ مہاجن اور اس کا لڑکا علانیہ گالیاں بکتے۔ سودا سلف بھی ناقص اور تھوڑا دیتے اور بسا اوقات دھتکار دیتے۔ مہتر تنگ آچکے تھے۔ لڑکے کی موت نے انہیں اور بیزار کر دیا وہ برملا کہتے کہ "دتی" نے جان بوجھ کر مداوا نہ کیا۔ بلکہ سانپ سے کھیل تماشا کرتا رہا اور باہر چلا گیا۔ اور لڑکا جان سے گزر گیا۔ چاہتا تو کیل ڈالتا اور لڑکا بچ جاتا"۔ پراشروں کی دیکھا دیکھی میگھ، رمداسئے اور دوسرے لوگ بھی مہتروں سے دور دور رہنے لگے۔

دروپدی پراشر کو اس کے لڑکے واسدیو نے دس روپے منی آرڈر کے ذریعے سے بھیجے تھے یہ رقم اس نے طوطی مہترانی کے سامنے وصول کی تھی اور اس کے جانے کے بعد احتیاط سے کھیس میں لپیٹ لی تھی۔ دروپدی رقم رکھ کر بھول گئی اور دوسرے دن شور مچا دیا کہ چوری ہو گئی۔ نائن نے سُنا

توچوری طوطی کے سر منڈھ دی اور کہا " میں نے طوطی کو مدرسے کی اوٹ میں روپے گنتے دیکھا تھا۔" مہاجن کو دروپدی سے روپے لینے تھے۔ اس نے پولس میں رپٹ لکھوا دی۔ پولس نے تلاشی لی تو دس روپے برآمد ہو گئے۔ طوطی نے دُہائی دی کہ یہ رقم تو کل ہی مسور بیچ کر مہاجن سے لی تھی۔ مگر وہ مُکر گیا۔ پولس طوطی کو ساتھ لے گئی اور پرچہ چاک کر دیا۔ جھنزر روتے پیٹتے لمبردار کے پاس گئے وہ موجود نہ تھا۔ رتمنش نے دھتکار دیا اور لمبردارنی نے صلواتیں سنائیں۔ وہ مایوس واپس آ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مخالفت کی انتہا ہو چکی ہے۔ بستی میں اب کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی دادرسی کرے۔

دوسرے دن طوطی کا خاوند پیارا اور اس کا بھائی رکھا نارووال چلے گئے اور اپنے رشتہ دار کو جو پہلے بھی آڑے آ چکا تھا ملے اور اپنی داستان کہہ سنائی۔ وہ ملکی فوج میں تھا انہیں اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ افسر نے اپنی تسلی کے بعد انسپکٹر علاقہ کو جو نارووال میں مقیم تھا بلا کر واقعات سے آگاہ کر دیا اور تفتیش کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے کہا۔ انسپکٹر اسی وقت موقع پر روانہ ہو گیا۔ پیارا اور رکھا آ سے پہلے ہی وہ گاؤں میں پہنچ چکا تھا۔ دریں اثنا تھانیدار علاقہ بھی آ گیا۔ طوطی ذرا دور بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ اور گاؤں والے انسپکٹر کی آمد پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا گل کھلتا ہے۔

دروپدی سے نئے سرے سے پوچھ گچھ ہوئی۔ اس نے اپنے پہلے بیان کی تصدیق کر دی۔ بسنتی نے پہلے تو مکمل تائید کی مگر بعد کو انسپکٹر کے بدلے ہوئے

تیور دیکھ کر پھر گئی۔ بلکہ مخالف ہو گئی۔ اور کہہ دیا "یونہی سرسری بات ہوئی تھی۔ دروپدی نے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ توبہ میری! طوطی بیچاری نہ چور نہ چور کی ساجھی وہ کیا جانے؟ چور کو چور ہی پہچانے، میں کیا جانوں؟ جانے دروپدی!"

مہاجن پہلے تو مضبوط رہا۔ بات جب بہی کھاتہ تک پہنچی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور بڑی سنجیدگی سے کہا "گھر کی بیوی ہانڈی گھر کتوں جوگا" دن بھر تو بھرتی رہتی ہے، خدا جانے کون لے گیا یا رکھ کر بھول گئی۔ طوطی کو روپے تو میں نے ان ہاتھوں سے خود ٹھوک بجا کر دئے تھے۔ اندراج بہی میں کر لیا تھا۔ خدا کو جان دینی ہے۔ اپنی تحریر سے کیونکر مُکر جاؤں؟ جھوٹے کے آگے سچا رو مرتا ہے۔ بیچاری طوطی کا کیا حال ہے، دیکھا نہیں جاتا۔" تھانیدار نے مسکرا کر کہا "واہ شوری شاہ! تمہارے کیا کہنے تم خوب آدمی ہو۔ دنیا تمہارے ہی دم قدم سے قائم ہے۔!" انسپکٹر نے لمبردار کو مخاطب کر کے کہا پنڈت جی! معاملہ تو صاف ہو گیا۔ طوطی بے گناہ ہے۔ اس کے روپے اس کے اپنے گھر ہی میں ہیں۔ ذرا دیکھا بھالی کر لیں تو مل جائیں گے سپاہیوں نے گھر کی چیزیں الٹفل پتھل کیں تو کچھ نہ ملا۔ لمبردار نے نادانستہ کھیس کو جھاڑا تو روپے چھن چھنا تے زمین پر آرہے۔ تھانیدار نے نائن، دروپدی، مہاجن کو تحویل میں لے لیا۔ اور جاتے جاتے نائی کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ طوطی کو رہا کر دیا اور ان چاروں کا چالان زیر دفعہ ۱۸۲ مرتب کر لیا اور ضمانت پر انہیں چھوڑ دیا۔ جب گاؤں آئے تو چوکڑی بھولے

ہوئے تھے مہاجن کی حاضر جوابی مفقود، نائن کی چرب زبانی گم اور نائی کی شیخی کرکری ہو چکی تھی۔ دروپدی حیران تھی کہ بیٹھے بٹھائے کیا بپتا مول لے لی۔ بھاگے بھاگے لمبردار کے پاس گئے اور مصالحت کے لئے کہا مہتر تو مان گئے مگر مقدمے کی نوعیت سرکار بنام دُتی وغیرہ تھی مہتر محض گواہ تھے اس لئے کچھ بن نہ پایا اور لمبردار کی محنت اکارت گئی۔

مقدمے کی سماعت تحصیلدار انسکر گڑھ کی عدالت میں ہوتی تھی۔ مہاجن نے ساجھی میں وکیل کر لیا۔ پچاس روپے دینے کئے۔ اپنا حصّہ دلالی میں کاٹ لیا دروپدی کا بیٹا جالندھر سے پیشی پر آتا۔ بیچارے کا خرچ سے کچومر نکل گیا۔ آخر صفائی کی شہادت کے بعد بحث ہوئی۔ تو تحصیلدار صاحب نے ملزموں کو قید تا برخاستِ عدالت اور ۲۵ روپے جرمانے کی سزا دی۔ آخر قید کاٹ کر اور جرمانہ دے کر روتے پیٹتے گھر آ گئے۔ دوسری صبح لمبردار اٹھا تو دیوانخانے کے صحن میں ایک خوبصورت بنڈل پڑا پایا۔ جس پر جلی الفاظ میں لکھا تھا "تمہارے ہندو دھرم نے خودداری چھین کر ہمیں چوٹی دے دی تھی ہم نے عدالت کے ذریعہ سے اپنی خودداری واپس لے لی ہے اور تمہیں چوٹی واپس کر رہے ہیں رسید سے اطلاع دینا شکریہ"۔ اس بنڈل میں علیحدہ علیحدہ دھاگے سے بندھی ہوئی تیس چوٹیاں تھیں۔ لمبردار بھوچکا رہ گیا۔ اس کے لڑکے نے بتایا کہ مہتر عیسائی ہو چکے ہیں۔ اس کا دل بیٹھ گیا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مہتروں سے متعلق اسے سان گمان بھی نہ تھا کہ وہ عیسائی ہو جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ وہ نقلِ مکان کر لیں گے تیسرے دن مدرسے

میں حکم آگیا کہ عیسائی لڑکوں کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ بٹھایا جائے۔ ان کے نئے ناموں سے حاضری لگائی جائے اور آئیندہ انہیں عیسائی کہا جائے یہ حکم مکتی فوج کا افسر خود تعمیل کے لئے لایا۔ مولوی صاحب مجبور تھے مگر پراشر اور دوسرے لڑکے اس کے لئے تیار نہ تھے۔ عیسائی چٹائی پر آ گئے تو ہم چھوت سے بچنے کے لئے زمین پر ہو لئے۔ یہ منظر بڑا عبرت انگیز تھا عیسائی ہنستے تھے اور ہم خفیف ہوئے جاتے تھے۔ چند ایک کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ اور میری تقلید میں "میرا بھائی" بھی۔ میں نے اپنا کرتہ اس کے نیچے بچھا دیا اور آپ زمین پر آلتی پالتی لگا لی۔ مکتی فوج کے افسر کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے جھگڑے کے پیش نظر مدرسے میں چھٹی کر دی۔ جب ہم گھر واپس آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی داؤ میں اپنا سب کچھ ہار بیٹھے ہیں۔ جب آپ بیتی سنائی تو باپ مسکرا دیا۔ دادی نے مہتروں کو بے نقط گالیاں سنا دیں۔ ماں نے پہلے تو سُنی ان سُنی کر دی اور پھر دفعتہً چونک کر بولی "تم بیٹھنے کے لئے گھر سے بوریا لے جانا" گاؤں میں چند دن اس کا چرچا رہا۔ اور عیسائی ہمارے لئے ایک اعجوبہ بن گئے

مہتر بننے کو عیسائی تو بن گئے مگر "عیسائی" کا صحیح تلفظ بھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ اپنے کو "حسائی" کہتے اور لوگ مذاق سے انہیں "قصائی" پکارتے اپنے نئے ناموں سے وہ مانوس نہ ہو سکے۔ بگاڑ کر بولتے۔ مگر عیسائی ہوتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو "صاحب بہادر" سمجھنا شروع کر دیا اور پراشروں کو اپنا مفتوح غلام۔

بات پھیل گئی کہ گاجی پور کے مہتر عیسائی ہو گئے۔ ہر چند انکی شکل و شمائل
میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور وہ عین مین پہلے ہی سے تھے، پھر بھی اعجوبہ سمجھ کر
آس پاس کے لوگ انہیں دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ مکتی فوج والوں نے
پہلے ہی رپٹ لکھوا رکھی تھی۔ پولس والے کسی کو عیسائیوں کے نزدیک نہ
آنے دیتے۔ شکر گڑھ کے آریوں کا ایک پرچارک وفد جس میں وکلا، ڈاکٹر اور
مہاجن شامل تھے مہتروں کو سمجھانے کے لئے آیا۔ مکتی فوج کے افسر سے ملا
تو صحبت شروع کر دی۔ اس نے بعد عجز کہا کہ "میں جنم سے بھنگی ہوں۔ گندگی
اٹھانا میرا کام تھا۔ مسیح کی مسیحائی ہے کہ تم سے مصافحہ کرنے کے لائق ہو
گیا۔ مجھے چھوڑئیے، سمجھانا ہے تو گاؤں کے عیسائیوں کو سمجھائیے۔" گاؤں کے
عیسائیوں نے پہلے تو ملنے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر رضا مند ہو گئے۔ وفد کے
لیڈر نے دلائل تمثیلات اور منتروں سے ہندو دھرم کی عظمت کا پُر اثر نقشہ
کھینچا۔ اور انہیں آبائی مذہب میں پھر سے آنے کی دعوت دے دی۔ عیسائیوں
میں سے ایک نے کہا "تم لوگ ہمیں دوبارہ اچھوت بنانے آئے ہو۔ اب
ہم تمہارے جھانسے میں آنے کے نہیں۔" وفد کے لیڈر نے کہا "نہیں نہیں ہم تمہیں
"زنّار دار" بنانے آئے ہیں۔ ہم تمہارے لئے پیغام امید لائے ہیں۔ ہم
تمہیں آریہ (نیک) بنانے آئے ہیں"

اس نے کہا "ہم راضی ہیں! ذرا پراشروں سے پوچھ دیکھو، کیا وہ روٹی
بیٹی کا رشتہ کر لیں گے؟" پراشر ساتھ کے سودھن برہمنوں سے رشتہ
کرنا روایات کے خلاف سمجھتے تھے، عیسائیوں کو کیا خاطر میں لاتے! وفد

ناکام لوٹ گیا۔ جسٹر کے اکالی خود تو پیچھے رہے۔ مگر "مذہبی دل" کو زور آزمائی کے لئے بھیج دیا۔ وہ گانے بجاتے "ست سری اکال" کے نعرے لگاتے عیسائیوں کی بستی کی طرف مڑے۔ پولس نے انہیں روک دیا۔ مگر عیسائی مکتی فوج والوں کی قیادت میں ان کے استقبال کے لئے نکل آئے۔ احترام سے انہیں اندر لے گئے اور چارپائیوں پر بٹھا دیا۔ ایک مکتی فوج والے نے ازراہِ تمسخر کہا "سردار جی! امرت چھکنے[1] اور رہت[2] میں رہنے کے باوجود ابھی تک چوتھا پوڑا[3] چلے آتے ہو۔ آؤ! خداوند یسوع کی پناہ میں آؤ۔ اس کی کرامت دیکھو آپ کو آج ہی پہلا پوڑا بنا دیتے ہیں۔ دنیا کی بادشاہت تو ہے ہی، آسمان کی بادشاہت کے بھی حقدار بن جاؤ گے۔ مذہبی کے لغوی معنی لغات میں دیکھ لو۔ میرے منہ سے نہ کہلواؤ۔ کہتے خجالت آتی ہے۔ آؤ تمہیں مذہبی نہیں خالص سکھ بنا دیتے ہیں۔ حضرت یسوع کا چیلا۔"

مذہبی پہلے تو سٹپٹائے مگر بعد کو ٹھنڈے پڑ گئے اور اٹھنا بھی محال ہو گیا۔ جوں توں کر کے جان چھڑائی اور بے نیل مرام لوٹ آئے۔ لوگوں نے پوچھا تو کہہ دیا کہ مکتی فوج والوں نے ایسی پٹی پڑھائی ہے کہ ان کی بدھی (عقل) بھرشٹ (خراب) ہو گئی اور عاقبت خراب، انہیں چھوڑو۔"

مکتی فوج والوں نے میگھوں اور رمداسیوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا مگر وہ عیسائی بن کر مہتروں کی سطح پر آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اچھوت ہوتے

---

[1] سکھوں کا بپتسمہ [2] پابندِ اصول [3] چوتھا درجہ

ہوئے بھی وہ اپنے کو مہتروں سے بلند سمجھتے تھے۔ اور اس خوش فہمی کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ بدیں وجہ عیسائی بننا قبول نہ کیا۔ میگھوں کے چوٹی تو تھی ہی، زنار لے کر آریہ بن گئے۔ اور مہاشہ (بلند نظر) کے لقب سے ملقب ہو گئے۔ اکالیوں نے رمداسیوں کو امرت چھکا کر خالصہ بنا لیا۔ گاؤں تین حصوں میں بٹ گیا۔ مہتر عیسائی ہو گئے۔ میگھ آریہ اور رمداسئے اکالی۔ براہمنوں نے میگھوں اور رمداسیوں کی تبدیلیٔ مذہب کو کوئی اہمیت نہ دی مگر مہتروں کا عیسائی ہو جانا انہیں بہت برا لگا۔ اور ان کے خلاف ہو گئے۔ مظاہروں اور جوابی مظاہروں نے گاؤں کی فضا مکدر کر دی۔ ہر وقت دنگے فساد کا اندیشہ رہتا۔ مذاہب جو امن و آشتی کے پیغام بر تھے، نزاع و فساد کا باعث بن گئے جو آخر ایک دن واقع ہو کر رہا۔ رمداسیئے اور میگھ ایک طرف تھے اور عیسائی دوسری طرف۔ اور براہمن میگھوں کی حمایت میں۔ لاٹھی چل گئی۔ ہر دو جانب سے آدمی زخمی ہو گئے۔ شرارت بڑھنی گئی روز روز کی چپقلش سے تنگ آ کر سرکار نے تعزیری چوکی بٹھا دی اور تاوان کی شکل میں گاؤں والوں پر خرچہ ڈال دیا۔ مذہب کے پرستاروں اور خدا کے نام کی دوہائی دینے والوں نے گاؤں کے گاؤں کو بدمعاشوں کی بستی بنا دیا۔ گاؤں کی اقتصادی حالت پہلے ہی اچھی نہ تھی۔ رہی سہی بھی ختم ہو گئی۔ ۱۲۰ روپے کے تاوان نے کچومر نکال دیا۔ پولس والے شربت شیرہ ڈلی کی دوکان سے چٹ کر جاتے اور شوری کی دوکان سے جو چاہتے باوا کا مال سمجھ کر اٹھا لیتے۔ مرغی، انڈا، دودھ، گھی جو ہاتھ لگتا اڑا لیتے

کاشت بھی بے دلی سے ہوئی۔ غرض کہ گاؤں بربادی کے کنارے آلگا عورتیں بھی ڈرتی گھروں سے باہر نہ نکلتیں۔ دُنی ؔ کی دوکانداری ختم ہوگئی۔ شوری ؔ کا کاروبار چوپٹ ہوگیا۔ میرا باپ آزردہ رہنے لگا۔ اکثر کہتا "یہ دھرتی اب رہنے کے لائق نہیں رہی"۔ ماں اور دادی بھی سہمی سہمی رہتیں کہ کہیں آفت نہ ٹوٹ پڑے۔ گاؤں میں "تخریب آسودگی" جسے تبلیغ اور دھرم پرچار کا نام دے رکھا تھا، کا زور تھا۔ اور ایک دوسرے کے بزرگوں پر کڑی نکتہ چینی اور بہتان تراشی معمول ہوگیا تھا۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کے دلوں میں نفرت و حقارت، بدگوئی، بدبینی کے بیج بوئے جارہے تھے مدرسے کی حالت دگرگوں ہورہی تھی۔ نت نئے ہنگامے اُٹھتے اور ہیجان کا باعث بنتے۔ پڑھائی کی طرف لڑکے توجہ ہی نہ دیتے۔ ہم عیسائیوں کے ساتھ ایک ہی چٹائی پر بیٹھتے۔ گھر آتے تو پانی کے چھینٹے لے لیتے اور بزعم خود شدھ ہوجاتے۔ یہ عمل بھی چند ہفتوں کے بعد بند ہوگیا اور ہم نے اس بے جا تکلّف کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ ان ناخوشگوار حالات کے باوجود میں اور "میرا بھائی" اپنی تعلیم سے غافل نہیں تھے۔ تندہی سے کام کرتے رہے۔ امتحان میں ابھی تین مہینے باقی تھے۔ میں نے اپنا کورس ختم کرلیا تھا۔ اور نظرثانی کررہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ پچھلے پرچوں کا حل دیکھ رہا تھا۔ "میرا بھائی" قاعدہ ختم کرچکا تھا میری کتاب اٹھا کر ہجے کرنے شروع کردیتا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ اور مجھے یقین ہوجاتا کہ ترقی کی اگر یہی رفتار رہی تو وہ ایک دن ضرور بڑا آدمی بن کر

رہے گا۔ مولوی صاحب بھی اس کے کام سے مطمئن تھے۔ باپ اور دادی بھی خوش تھے مگر ماں بے نیاز تھی۔!
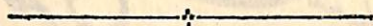
نکّو نے اپنی کہانی جاری رکھی اور کہا :

"اے میرے عزیز دوست ! یہ ان بھلے وقتوں کی بات ہے جب خدا اپنے مقبول بندوں سے گھُل مل کر بات چیت کر لیا کرتا تھا ۔ کہ زرتشت نے یزداں سے پوچھا " اے ساری دنیا کے خالق ! ذاتِ پاک ! بتا ! وہ افضل وارفع مقام کونسا ہے جہاں یہ سطحِ خاک انتہائی مسرت محسوس کرتی ہے ؟"

یزداں نے جواب دیا " اے زرتشت ! وہ جگہ جہاں کوئی باآوازِ بلند اچھی باتیں کہتا ، شریلی لَے میں میتھرا اور رام سوتر گاتا چلا جاتا ہے ۔"

اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمارے گاؤں کا چپہ چپہ ، ذرّہ ذرّہ بظاہر افضل وارفع بن گیا تھا ۔ سِکھ اور برہمنوں کے لڑکے ٹولیاں بنا کر بھجن گاتے ۔ ابھی یہ جلوس ختم نہ ہو پاتا کہ شیخوں اور لوہاروں کے لڑکے نعتیں حمد کے اشعار الاپتے چلے آتے ۔ پھر عیسائی لڑکے صلیب اٹھائے

مناجات کے نغمے سناتے۔ اور رمداسئے ڈھولک کی گمک پر کیرتن کرتے۔ اگرچہ ترتیب میں بسا اوقات تبدیلی ہوجاتی مگر معمول میں فرق نہ آتا۔ سچ پوچھئے تو یہ راگ رنگ سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ فریقین کے دلوں میں تیر ونشتر بن کر چبھتے۔ اور خرمنِ امن کے لئے چنگاری کا کام دیتے تھے۔ جس کے بھڑک اٹھنے کے امکانات ہر وقت موجود تھے۔ پولس نے نقضِ امن کے پیشِ نظر مظاہروں کا حلقہ محدود کر دیا۔ پھر بھی کشیدگی بڑھتی گئی۔ خدا کے ان پرستاروں نے ان بھجنوں اور گیتوں کو حقارت ونفرت کا حربہ بنا لیا۔ جو اشتعال کا کام دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی کوتہ اندیشی سے خدائے واحد اور محیطِ کل کو اپنے اپنے دائرے میں محبوس کر لیا۔ میرے باپ نے ان دائروں کے گرد ایک بڑا دائرہ بنا لیا اور انہیں اپنے گھیرے میں لے آیا۔ اور یہ مذہبی گیت گانے شروع کر دئے۔ ہمسائے متحیّر رہ گئے۔ ایک دن اکٹھے ہو کر آئے اور کہا "دھنپت! تو نے غضب کر دیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے خدا کو اپنے گھر لے آیا۔ ہم کانوں میں انگلیاں ڈالے پھرتے ہیں۔ اس حماقت سے باز آ، ورنہ تیرے لئے اچھا نہ ہوگا۔"

باپ نے مسکرا کر کہا" میں تو اپنے کھیت کا گندم سمیٹ کر اپنے گھر لے آیا ہوں۔ تم اسے گیہوں کہہ لو یا کنک یا تحصیلدار کی تقلید میں وِیٹ (Wheat) اس میں میرا کیا قصور؟"

"مگر یہ گانے تو مسلمان اور عیسائی گاتے ہیں"۔ انہوں نے کہا

باپ نے جواب دیا" تو کیا ہُوا؟ شاملات کا کنواں خراب ہو گیا تھا

حسینا گوجر نے مجھے پانی دے دیا۔ میری فصل بچ گئی۔ کل نلپٹ عیسائی نے راہ چلتے میرے کھیت میں گوبر پھینک دیا تھا۔ میرے فائدے اور میرے ہاتھ کی چیزیں تھیں۔ میں کیوں چھوڑتا؟ زہے قسمت! میں تو ان کا شکر گذار ہوں"۔

"سہی، پر تم اپنی عاقبت کیوں بگاڑ رہے ہو؟" انھوں نے کہا۔

باپ نے ایک قہقہہ لگایا اور یہ کہہ کر کہ "تم کیوں فکر کرتے ہو اگر میں محاصل ادا نہیں کر پایا تو لمبر دار تم سے باز پرس نہ کرے گا۔ یقین جانو اس کی جواب دہی مجھے ہی کرنی پڑے گی کسی اور کو نہیں"۔ اپنے کھیتوں کو چلا گیا۔ راستے میں مولوی صاحب ملے تو انہوں نے پوچھا "بھائی دھنپت! کس سوچ میں جا رہے ہو؟" باپ نے مسکراتے ہوئے کہا "مولوی جی! ان لوگوں نے خدا کی زمین دھینگا مشتی سے بانٹ لی، اب خدا کے حصے بخرے کرنے کے در پے ہیں۔ سوچتا ہوں یہ کیونکر ممکن ہو سکے گا؟"

مولوی صاحب نے میرے باپ کی طرف غور سے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر وہ آگے نکل چکا تھا۔ گاؤں میں چرچا پھیل گیا کہ دھنپت بیک وقت عیسائی اور مسلمان ہو گیا۔ ماں تو سن کر سہم جاتی مگر دادی لڑتی جھگڑتی اور کمر باندھ کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔ لڑکے ہمیں چھیڑتے اور ستاتے تو ہم ان سنی ان سنی کر دیتے۔ ایک دن ماں نے اندر لے جا کر پوچھا "نکو سچ سچ بتا ان بھجنوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے بھجن کون کون سے ہیں۔ میں یہ سمجھ نہ پائی۔ ایک بھجن تو مدرسہ والا ہے "تعریف اس خدا کی..." یہ بھجن کس کا ہے؟"

میں نے کہا "میں کیا بتاؤں؟ مجھے تو سب ایک سے لگتے ہیں۔ پربھو بھگتی (عبادت الٰہی) کے۔" یہ سن کر وہ خاموش ہوگئی۔

باپ آیا تو معمول کے خلاف اداس دکھائی دیتا تھا۔ دادی نے رام کہانی سنائی تو اور دکھی ہوگیا۔ اور کہا "یہ ہمارے آبا و اجداد کا گاؤں۔ افسوس! اب رہنے کے لائق نہیں رہا۔" دادی تو خاموش رہی مگر ماں نے کچھ دیر کے بعد کہا "کہاں جاؤگے یہ دھرتی چھوڑ کر؟ یہ ٹھنڈی ہوا، یہ ٹھنڈا میٹھا پانی اور کہاں ملے گا؟" باپ نے پہلے ماں کی طرف دیکھا اور پھر دادی کی طرف۔ اور مسکرا کر چپ ہوگیا۔ لوگوں سے ڈر کر ہم نے دروازے بند کر کے بھجن گانے شروع کر دئیے اس پر بھی ماں بار بار مسلمانوں اور عیسائیوں کے گانے دھیمی آواز میں گانے کے لئے کہتی۔ ہم لوگوں نے سب گانے ہولے ہولے گانے شروع کر دئیے۔ جب مسلمانوں اور عیسائیوں کو پتہ لگا کہ ہم نے ان کے خداؤں کو اپنا لیا ہے تو بہت سیخ پا ہوئے اور ہمارے اس فعل کو کفر سے تعبیر کرنے لگے۔ غرض کہ ہماری کیفیت یہ تھی

"تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو!"

میں وظیفہ کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل آگیا تھا اور چار روپے ماہوار وظیفہ لگ گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے ۲۵ روپے جیب خاص سے مرحمت فرمائے تھے۔ خوشی میں مولوی صاحب نے مدرسے میں چھٹی کر دی اور میرا نام رجسٹر میں درج کر لیا۔ گورداسپور گزٹ میں میری تصویر بھی آ گئی اور دوسرے اردو انگریزی اخباروں میں بھی میرا نام شائع ہوگیا۔ مخالفت

اور افسردگی کے اس دور میں اس واقعہ نے ہمارا وقار بحال کر دیا۔ اور ہمارے
گھر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دادی اس کامیابی کو اپنی پرارتھنا کا پھل
سمجھتی۔ مولوی صاحب اپنی غیر معمولی توجہ کا نتیجہ اور باپ اسے اتفاقی شگوفہ
میرے لئے یہ ایک غیر متوقع اور حیران کن بات تھی۔ مگر ماں نے اسے
غیر اہم سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ مولوی صاحب بدھائی کے لئے آئے
تو دادی کام میں لگی رہی۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ مجھے اونچی جماعت میں موضع
دودھا چلا جانا تھا مولوی صاحب سے اب کوئی گوں نہ رہی تھی اس لئے اس
نے بے اعتنائی برتی۔ مگر باپ نے عزت سے انہیں چارپائی پر بٹھایا۔ ان
کا شکریہ ادا کیا۔ اور دادی کے اشاروں کنایوں سے روکنے کے باوجود پانچ
روپے ان کی نذر کر دئے اور وہ خوش خوش واپس چلے گئے۔ وظیفہ کی بدولت
میرے لئے رشتے بھی آنے شروع ہو گئے۔ اور چرچا پھیل گیا کہ دھنپت کا
لڑکا نکو، صاحب بہادر کی نظر پر چڑھ گیا ہے اب کچھ نہ کچھ بن کر ہی رہے
گا۔ لمبردار بھی آیا۔ دادی اور باپ کو بدھائی دی اور کہا "بھائی! اسے کچھ
کم نہ سمجھنا۔ بڑی بات ہے۔ نکو نے نہ صرف ہمارے بدقسمت گاؤں کا بلکہ
پراشروں کا نام بھی بلند کر دیا ہے۔ اس کی تعلیم جاری رکھنا رشتے کی جلدی
نہیں۔ ابھی اور پڑھ لینے دو۔ رشتے آتے ہی رہیں گے۔"

باپ تو مسکرا دیا مگر دادی نے کہا "بیٹا! میرے جیتے جی یہ کام ہو
جائے تو اچھا ہی ہے۔ یہ خوشی بھی دیکھ لوں۔ اب کے دن جینا ہے۔
چند روز کی مہمان ہوں۔"

لمبردار نے کہا " چاچی فکر نہ کر، دس بیس برس تو تیرا کچھ نہیں بگڑتا۔
تیرا پوتا پڑھ لکھ لے، آپ سے آپ اچھے رشتے آنے لگیں گے اور جہیز بھی
اچھا خاصا مل جائے گا۔ میرا ذمّہ "

معمولی حیثیت کے رشتے آتے رہے اور دادی انکار کرتی رہی۔ وہ
بڑے گھر کی ٹوہ میں تھی۔ مگر کسی بڑے گھر نے ہماری طرف نہ دیکھا۔ ماں ان
باتوں کو دلچسپی سے سنتی مگر دخل نہ دیتی۔ میرے اور میرے بھائی " کے لئے یہ
مسرتوں اور شادمانیوں کے دن تھے۔ گاؤں میں ہماری قدر و منزلت بڑھ گئی
تھی۔ اور گھر میں توقیر۔ میرا عہد کہ میں وظیفہ لے کر چھوڑوں گا پورا ہو گیا تھا اور
آئندہ سے متعلق بھی پُر امید تھا۔ مولوی صاحب کو پانچ روپے دے کر باقی بیس
بچے۔ بقیہ جوتے کپڑے فراہم کر دئے جنہیں پہن کر ہم اپنی نظروں میں بھی سربلند
اور ممتاز ہو گئے۔ اور جب میں لکھی کو جوتا پہنے مٹک مٹک کر چلتے دیکھتا تو پھولا
نہ سماتا۔ دادی موقع کی تلاش میں رہتی، جہاں چار عورتیں بیٹھی ہوتیں وہیں جم
جاتی اور سر اونچا کر کے فخریہ کہتی " سنتی ہو! میرے نکو کے ساتھ صاحب نے
ہاتھ ملایا اور پچیس روپے، بہن! پچیس روپے انعام دیا۔" اس کا اتنا شہرہ
ہوا کہ عورتوں نے میری دادی کا نام " بہن پچیس روپے " رکھ دیا۔ یہ نام اتنا
مقبول ہوا کہ دور دور تک پھیل گیا۔ اور ہر کہ و مہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ کہنے
کی ضرورت نہیں کہ یہ نام موزونیت کے لحاظ سے بے مثل تھا۔ ہمارے ناموں
کا ماحصل، دادی کی آرزوؤں کا مرکز اور نچوڑ یعنی روپیہ۔ لچھمی، دھنپت، مایا
دولت رام، لکھپت کا لب لباب۔

دین ایک عالمگیر نعمت ہے اور فرقہ بندی محض مقراض زنی۔ دین درسِ انسانیت ہے فرقہ بندی محض تفریق پسندی۔ دین دلوں کو جوڑتا ہے فرقہ بندی اسے پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ دین محبت ہے فراخدلی ہے اور رواداری۔ فرقہ بندی تعصب ہے اور تنگ نظری۔ دین اخلاق و خوش اطواری کا جویا ہے، فرقہ بندی محض عقیدہ اور ذات کی ٹوہ لگانا۔ دین روشنی ہے، پیار ہے، امن و آشتی اور پاک و بے داغ، فرقہ بندی جھگڑا ہے فساد ہے جو تفریق کا باعث ہے اور عناد ہے جو انسان کو انسان سے جدا کرتا ہے۔ "گاجی پور" کے بھلے چنگے آدمیوں نے فرقہ بندی کو دین سمجھ لیا۔ اور جرائم پیشہ بن گئے۔ گاؤں میں تعزیری چوکی قائم کرا ڈالی۔ ۱۲۰ روپے ماہوار کا تاوان گاؤں والوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ شاملات دیہہ کے درخت بک گئے۔ آموں کی فصل پیشگی پر فروخت ہو گئی۔ زراعت رک گئی اور پولس کی دراز دستیوں نے ناک میں دم کر دیا مگر ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔ نیکی پاکیزگی اور عبادت کے بدلے شیطنت کو اپنا لیا۔ یہ نہ سمجھ پائے کہ شیطان خود خراب ہے۔ اس کے کام بہت خراب ہیں اور اس کی مزد اس سے بھی کہیں زیادہ خراب۔

اندھیری راتیں تھیں۔ دُنی کے لڑکے اجیت اور مہاجن کے لڑکے سنتو پر شیطان سوار ہو گیا اور انہوں نے عیسائیوں کے کپ میں چنگاری پھینک دی۔ آناً فاناً جھونپڑے خاکستر ہو گئے۔ آگ کے بھبھوکے دیکھ کر لوگ آگ بجھانے کے لئے دوڑے۔ دادی کے ٹوکنے کے باوجود باپ بھی پانی کا مٹکا سر پر رکھے پہنچ گیا۔ پولس بھی آ چکی تھی۔ عیسائی نقصان کی تاب نہ لا کر

مشتعل ہو گئے۔ اور بے تحاشا لاٹھی برسانا شروع کر دی۔ میرے باپ کا سر
پھٹ گیا۔ اور وہیں گر پڑا۔ پراشر، سکھ، رمداسیئے اینٹ پتھر، لاٹھی، سونٹا،
ڈنڈا، بانس کا ٹوٹا، جو ہاتھ پڑا لے کر عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے۔ جب خوب
چل چکی اور دونوں اطراف سے بہت سے آدمی زخمی ہو گئے تو پولس نے مداخلت
کر کے لڑائی بند کرا دی۔ اور زیر دفعہ ۱۴۷/۱۴۹ و ۳۲۳ پرچہ چاک کر کے پانچ عیسائیوں
اور پانچ پراشروں کو ہتھکڑی لگا لی۔ نائی مہاجن اور ان کے لڑکے بھی مطلوب
تھے مگر وہ روپوش ہو گئے۔ پکڑے جانے والوں میں سے ایک میرا بدقسمت باپ
بھی تھا۔ بے گناہ اور معصوم، جو جذبۂ ہمدردی سے متاثر ہو کر وہاں گیا، بدگمانی
کا شکار ہؤا اور اب مجروح و محبوس تھا۔ مجروح معائنہ کے لئے ننکر گڑھ بھیج
دئے گئے۔ یہ صدمہ ہمارے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ رات رو رو کے
کاٹی۔ دن چڑھتے ہی ماں اور دادی ننکر گڑھ چلی گئیں۔ میں اور "میرا بھائی"
دروازہ بند کر کے روتے رہے۔ افسردگی کا یہ عالم تھا کہ بچن بھی ہمارے
حلق سے نہ نکلتے تھے۔ نہ کھانے پینے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے لکھی کو دو چار
لقمے زبردستی کھلائے اور آپ بھوکا پڑ رہا۔ ہمارا گاؤں سنسان ہو گیا اور
بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ کچھ گرفتاری کے ڈر سے بھاگ گئے۔ کچھ چھپ
گئے۔ اور کچھ ننکر گڑھ چلے گئے۔ عورتیں ہی رہ گئیں اور وہ بھی سہمی سہمی سی۔
ماں ہانپتی کانپتی تھکی ہاری شام کو واپس آ گئی مگر دادی وہیں رہ گئی۔ سستانے
کے بعد ماں نے روتے روتے بتایا کہ "سر کی چوٹ تو زیادہ نہ تھی مگر خون
بہت نکلا۔ تیرا باپ پیلا پڑ گیا۔ مقدمے کے متعلق وہ کچھ نہ بتا سکی۔ صرف

اتنا کہا کہ ہتھکڑی کھول دی تھی اور سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی ۔ دادی نے روٹی تنور سے لا کر کھلا دی تھی ۔ ماں نے چولہے چوکے کا کوئی خیال نہ کیا ۔ دو روٹیاں بچی پڑی تھیں ، ہمیں کھلا دیں ۔ گائے بھوکی پیاسی تھی اس کے آگے بھوسی ڈال دی ۔ پانی پلا دیا اور کپڑے سنے بغیر منہ سر لپیٹ کر پڑ گئی ۔ ہم بھی لیٹ گئے ازدواجی زندگی میں پہلی رات تھی کہ خاوند گھر میں نہ تھا ۔ ماں رات بھر کروٹیں بدلتی اور بڑبڑاتی رہی ۔

صبح اٹھے تو ماں کچھ حوصلہ مند دکھائی دیتی تھی ۔ اس نے روٹی بنائی ہمیں کھلائی آپ کھائی ۔ گود میں لے کر ہمیں دلاسا دیا ۔ دو چار آنسو بہائے اور کھاٹ بچھا کر پڑ گئی ۔ دادی بھی دو بجے کے قریب آ گئی ۔ اس نے بتایا کہ لمبردار بھی پہونچ گیا ہے ۔ شکر گڑھ کے لوگ پراشروں کو چھڑانے کی کوشش میں ہیں بیٹے کے بارے میں وہ پر امید تھی کہ اس کا بال بیکا نہ ہوگا ۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر گڑھ پہنچتے ہی اس نے تحقیق کر لی تھی کہ ان معاملات میں ڈاکٹر کے ہاتھ میں بہت کچھ ہوا کرتا ہے ۔ وہ منت داری سے ڈاکٹر کے گھر جا پہنچی ڈاکٹرنی کو اپنی ناداری اور بیٹے کی معصومیت کی کہانی رو رو کے سنائی اور آتی دفعہ اس کے پاؤں پڑ آئی ۔ اسے امید تھی کہ ڈاکٹر ترس کھا کر اسے چھوڑ دے گا ۔

لمبردار چاہتا تھا کہ معاملہ گھر ہی میں نمٹ جائے ۔ وہ عیسائیوں کا نقصان بھرنے کو تیار ہو گیا ۔ چوٹیں شدید نوعیت کی نہ تھیں ۔ ڈنڈے سونٹے کی مار تھی اور اس سے کسان کا کیا بگڑتا ہے ؛ گنڈاسے سے بارہا انگلیاں کٹ جاتی

ہیں اور وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ مگر پولس رضا مند نہ ہوئی۔ الٹی لمبردار کے سر ہوگئی کہ نائی، مہاجن، سنتو، اجیت کو پیش کرو تاکہ چالان مکمل ہو سکے۔ حکم کی تعمیل میں وہ واپس آگیا۔ نائن اور مہاجن کی بیوی کو بلا کر کہا "روپوشی ہونے سے فائدہ نہ ہوگا۔ پولس ناحق تنگ کرے گی۔ پیش ہو جانا ہی مناسب ہے"۔ مگر وہ آنا کانی دے کر چلی گئیں۔

جاتے جاتے نائن کچھ ایسی پھونک مار گئی کہ لمبردارنی بھڑک اٹھی۔ اور جھنجلا کر لمبردار سے کہا "باہر میاں ہفت ہزاری گھر بیوی کرموں کی ماری" ساری دولت جھنڑوں کو ہی دے ڈالنا۔ رمیش کے لئے کچھ نہ چھوڑنا۔ آج گپ کا نقصان بھرنے لگے ہو۔ کل کلاں کوئی مر گیا تو اس کے بھی دام چکا دینا۔ اپنے کپڑے دیکھو کہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ میرا یہ حال ہے کہ کسی کے ہاں جاتے شرم آتی ہے۔ نمک گر جائے تو دیا کھیان شروع ہو جاتا ہے۔ بھجیا بڑھ جائے تو جھگڑا ختم نہیں ہوتا رمیش مانگے تو کفایت شعاری کی گردان ہے۔ آرام و آسائش کے سر خاک ضروریات میں بھی کمی کی رٹ رہتی ہے۔ مگر جھنڑوں پر بن جائے تو سب کچھ بھول کر دریا دل بن جاتے ہو۔ حیران ہوں برہمن کے گھر جنم لے کر تجھے اتنی لیگا نگت کیوں پیدا ہو گئی کہ انہیں "بیٹا" تک کہنے سے نہیں جھجکتے"۔

لمبردار نے کہا "میں تجھ سے پوچھوں تیرے کتنے بھائی ہیں"؟

لمبردارنی جھلا کر بولی "بھاڑ میں جائے! میرے بھائی کیوں گنو!"

لمبردار نے سنجیدگی سے کہا "اچھا نہیں گنتا! بھلا یہ تو بتا رمیش کے

کتنے بھائی ہیں۔؟"

لمبر وارنی نے کہا "تجھے پتا نہیں! اکیلا نمانا (عاجز۔ بے نوا) بہن نہ بھائی۔ اِدھر کا نہ اُدھر کا۔"

لمبر وار نے کہا "تو ٹھیک کہتی ہے! بھاگوان! میں گاؤں کی چوتھی پتی کا واحد مالک اس لئے نہیں ہوں کہ غازی مالدیو کا زیادہ قریبی ہوں! یا میں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے۔ گاؤں کے سب پراشر ایک سے ہیں۔ ہاں اگر کوئی بڑا ہو سکتا ہے تو پھر وہ غازی مالدیو کے بڑے لڑکے کے خاندان سے پرمیشری داس جی ہیں۔ ان بیچاروں کی زمین صرف بارہ ایکڑ ہے۔ اس پتی کو ہم اب بھی "بڑی پتی" کہتے ہیں اور تعظیماً اس پتی کے افراد کو "جی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں بڑا اس لئے بن گیا کہ میں اور میرے بزرگ تیرے رمیش کی طرح تیرے الفاظ میں "اکیلے، نمانے نہ بہن نہ بھائی، نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے" پشت ہا پشت سے چلے آتے ہیں۔ میرے دادا کا ایک بھائی تھا وہ سادھو ہو گیا۔ میرا باپ اور میرا دادا عمر بھر ہردوار، رکھی کیش بندرابن اور تھانیسر کی خاک چھانتے رہے مگر وہ نہ ملا۔ خود فریبی میں ایک فرضی سمادھ بھی بنا رکھی ہے۔ جسے ہم "دادا کی سمادھ" کہتے ہیں۔ میرا دادا زندگی بھر اس کی یاد میں آہیں بھرتا رہا۔ بھائی کتنی پیاری چیز ہے۔ تجھے اس کی گنتی بھی پسند نہیں میں اس خاندان ـــــــ اس بدقسمت خاندان ـــــــ کا فرد ہوں جسے کئی پشتوں سے بھائی دیکھنا نصیب نہ ہوا جو مصیبت میں کام آسکے۔ خیر میرا ذکر ہی کیا۔ کٹ جائے گی۔ رمیش کا بھی یہی حال ہے۔ کہو میرے بعد اس کا کون ہوگا؟ ہمیں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے غیروں کو "بھائی بیٹا" کہہ کر

اپنانا ہوگا۔" یہ کہتے کہتے اس کا گلا رُندھ گیا۔

لمبردارنی کو بیٹے کی بیچارگی اور بھائیوں کی یاد نے افسردہ کردیا۔ اپنے آنسو پونچھ کر بولی "چھوڑ تقدیر کا بدا کون میٹے، رہتی دنیا تک سلامت رہے ساتٹ بیٹوں کا منہ دھوئے۔ تیرا دل بہت ہلکا ہے۔ تجھ سے آئندہ ایسی بات نہ کہوں گی۔"

میرا باپ تیسرے دن واپس آگیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آتے ہی کھول کر پھینک دی اور حسینا کو ملنے کوٹلی چلا گیا۔ پتا لگا کہ باپ کے پیچھے وہ شکر گڑھ گیا ہوا ہے۔ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ صاحب (جس نے پچیس روپے دئے تھے) کی سفارش کام آئی اور دھنپت کو چھوڑ دیا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ معائنہ ہو رہا تھا تو ڈاکٹر نے مٹی میں لتھ پتھ کپڑے دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیونکر ہوا؟ باپ کو توضیح کا موقع مل گیا۔ اس نے مودب مگر مسکرا کر کہا "حضور میں مٹکا اٹھائے آگ بجھانے کیلئے گیا تھا۔ مگر بیچارے عیسائی دماغی توازن کھو بیٹھے۔ دوست دشمن کی تمیز نہ رہی اور لاٹھیاں مارنا شروع کر دیں۔ مٹکا ٹوٹ گیا، پانی بہہ گیا، سر پھوٹ گیا۔ سر کی چوٹ تھی، میں گر پڑا اور لتھ پتھ ہو گیا۔" باپ کی بے ساختگی معصومانہ اندازِ بیان، مسکراہٹ اور بھولے پن پر ڈاکٹر کو ترس آ گیا۔ اس نے توجہ سے زخم کا معائنہ کیا تو اسے مٹکے کی ایک چھوٹی سی کنکری بھی مل گئی۔ زخم کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ تیز دھار آلے کا زخم معلوم ہوتا تھا۔ اور استغاثے کے مطابق یہ لڑائی کند آلات سے لڑی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے کنکری کا ذکر وضاحت سے کر دیا اور اسے بے گناہ ٹھہرایا۔ پولس نے مزید تسلی کے بعد باپ کو چھوڑ دیا

اور گوہ بنا لیا۔ لمبردار کو پتا لگا تو وہ ہمارے گھر آیا۔ مولوی صاحب بھی ساتھ تھے
زادی کو بدھائی دی۔ باپ نے چارپائی بچھا دی اور خود چٹائی پر بیٹھ گیا۔ مولوی
صاحب نے پوچھا "بھائی دھنپت! ٹھیک رہے! کیسی گذری؟"

باپ نے مسکرا کر کہا "اچھی بیتی! حوالات میں عیسائی اور پراشر ایک ہو
گئے۔ کوئی مت بھید (اختلاف) نہ رہا۔ رہنا سہنا، کھانا پینا، برتن بھانڈا اور
ہتھکڑی ایک ہی تھی۔"

"کیا دل بھی مل گئے؟" مولوی صاحب نے گرمجوشی سے پوچھا۔

باپ نے کہا "جسم تو مل گئے۔ آنکھوں دیکھی کہتا ہوں، دلوں کی رام جانیں"

لمبردار نے بات کاٹ کر کہا "مجھے تو بڑا دکھ ہوا۔ تم سا آدمی اور یہ مصیبت!"

باپ نے جواب دیا "پنڈت جی! ٹھیک ہے۔ تمہیں دکھ نہ ہوتا تو اور
کسے ہوتا؟ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ چاند سورج کو بھی گہن لگ
جاتا ہے۔ میں کیا میری بساط کیا؟ ناکردہ گناہ پکڑا گیا۔ ٹڈی کی مار کا کیا علاج؟
کھیت اجڑ ہی جاتے ہیں۔ ناگہانی مصیبت پڑ ہی گئی۔"

لمبردار نے پوچھا "کیا سفارش تھی صاحب کی جو چھوٹ آئے؟"

باپ نے ہنس کر کہا "ٹاٹ کا لنگوٹا، نواب سے یاری۔ بھلا ہمیں کون پوچھتا
ہے۔ نیک دل ڈاکٹر نے ترس کھایا اور بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔"

مولوی صاحب نے لمبردار کو مخاطب کر کے کہا "گاؤں کی حالت خراب
ہو رہی ہے۔ مدرسہ اجڑ رہا ہے اس کا سدھار (اصلاح) کیجئے۔"

لمبردار نے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر باپ کو مخاطب کر کے کہا "دھنپت!

نہیں بتاؤ۔ کیا کروں مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔"

باپ نے ایک آہ بھری اور کہا "پنڈت جی! کیا بتاؤں! گھروں میں آگ لگ جائے تو بستیاں آپ سے آپ اجڑ جاتی ہیں۔ گاؤں اب رہنے کے لائق نہیں رہا۔" یہ کہہ کر میرا باپ اٹھ کھڑا ہؤا۔ اور یہ "مجلسِ مشاورت" کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہوگئی۔ اٹھتے اٹھتے مولوی صاحب نے کہا "بھائی دھنپت! اداس نہ ہونا بعض اوقات ہتھکڑیاں ہاروں سے اعلےٰ درا رفع ہؤا کرتی ہیں۔" باپ مسکرا کر چپ ہو رہا۔

مقدمہ گورداسپور میں دائر تھا۔ نائی اور اس کے بیٹے اجیت، جہاجن اور اس کے لڑکے سنتو نے عدالت میں حاضر ہو کر اپنی ضمانتیں کرالیں تین چار دن کے بعد باقی بھی ضمانت پر آگئے۔ اتنی خواری کے بعد بھی فریقین کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ عناد کا بھوت ان کے سر پر سوار تھا۔ گزرتے بھی تو ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے۔ کہتے ہیں "امن ہو تو کسان چٹان میں سے بھی رزق ڈھونڈ نکالتا ہے۔ شر ہو تو زرخیز کھیت میں سے بھی تباہی کے سوا اسے کچھ نہیں ملتا۔" زمین ویران پڑی تھی۔ کسی کو ہل چلانے کا بھی خیال نہ آیا۔ گاؤں علیحدہ علیحدہ دو گروہوں میں بٹ گیا تھا۔ پراشروں کے حمایتی جہاتے اور اکالی تھے۔ اور عیسائیوں کے مکتی فوج والے۔ پراشر اور ان کے حمایتی گو تعداد میں زیادہ تھے۔ مگر عیسائیوں کے حمایتی بارسوخ تھے۔ یوں بھی عیسائی ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ ان کی عورتیں ادھر اُدھر جا کر محنت مزدوری کرلیتیں۔ مگر پراشروں سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ ہماری عورتوں کو کوڑا کرکٹ

خود ہی اٹھانا پڑتا۔ لمبردار نے ہزار کوشش کی کہ بگڑی بن جائے مگر کوئی صورت بن نہ آئی۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔

انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ "دین کی دولت پاکر لوگ تلواروں کے ہل بنالیں گے اور برچھوں کی قینچیاں" مگر یہاں الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ دین کی دولت پاکر عیسائی اور بپھر گئے۔ قینچیوں کی برچھیاں اور ہلوں کی تلواریں بنالیں۔ جو بھی کماتے اسلحہ خرید لاتے۔ پراشر بھی خاموش نہ تھے۔ انہوں نے بھی اکالیوں اور مہاشوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا اور آپ بھی عیسائیوں کی بیخ کنی کے منصوبے بنانے لگے۔ انسانی دماغ شیطان کی کارگاہ بن گیا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتے۔ ارتکاب قتل کی دفعہ کے سوا تعزیرات ہند کی تمام دفعات کے تحت مقدمے ایک دوسرے کے خلاف دائر کر رکھے تھے۔ اور نت نیا جھگڑا کھڑا کر دیتے۔ میرا باپ اگرچہ ان جھگڑوں سے دور رہتا اور بات کو "ہاں ہوں" میں ٹال دیتا۔ پھر بھی وہ بہت دکھی رہتا۔ نائن ڈائن گھر گھر جاتی۔ لوگوں کو اکساتی۔ مہاجن پھبتیاں اڑاتا اور آوازے کستا غرض کہ گاؤں کی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ باپ اٹھتے بیٹھتے یہی کہتا "گاؤں اب رہنے کے لائق نہیں رہا" ماں اور دادی سن کر چپ رہ جاتیں

ایک دن باپ لمبردار کے پاس گیا۔ وہ پیپل تلے بیٹھا لوگوں کے دکھ سکھ سن رہا تھا۔ وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ میرا باپ علیحدگی پسند تھا۔ کہیں آنا جانا نہ تھا۔ لمبردار اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور کہا "دنفینت! خیر باشد نمم؟ راستہ تو نہیں بھول گئے؟"

باپ نے کہا "پنڈت جی! گاؤں رہنے کے لائق نہیں رہا ہتھکڑی لگ گئی - آبرو خاک میں مل گئی۔ گواہی کا جھگڑا در پیش ہے۔ پولس والے اپنے مطلب کی گواہی چاہتے ہیں۔ غازی مالدیو کا نام ڈبو دیا۔ زمین خرید لو تو چلا جاؤں"

لمبردار سن کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ سنبھلنے کے بعد بولا "گواہی کی فکر نہ کر، تیرا پلّا چھڑا دوں گا۔ جانے کا ذکر کیوں کرو؟ حالات سدھر جائیں گے۔ زمیندار کہلاتے ہو، زمین نکل گئی تو پھر ہاتھ نہ آئے گی۔"

باپ نے کہا "اونچ نیچ سوچ لی۔ کھیتی باڑی میں جی نہیں لگتا۔ بانجھ عورت بنجر زمین اور بھلا گائے کو کون پالے۔؟ حسینا گوجر کوٹلی والا بھی شاید لے لے۔ مگر دل نہیں مانتا۔ کوئی پراشر خرید لے تو زمین خاندان میں رہ جائے۔ ورنہ اسی سے طے کر لوں گا۔"

لمبردار نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "کہاں جاؤ گے؟ کیا کرو گے؟"

باپ نے کہا "امرتسر جاؤنگا۔ مزدوری کروں گا۔"

لمبردار نے افسردہ ہو کر کہا "اگر تمہیں جانا ہی ہے تو لے لوں گا۔ زمین تمہاری امانت رہے گی جب چاہو زر اصل دے کر چھڑا لینا۔"

باپ نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "کیا گھر، ہل اور گائے بھی لے لو گے۔"

لمبردار کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آنکھیں پونچھتا جواب دئے بغیر باہر آگیا دوسرے دن لمبردار ہمارے گھر آیا تو باپ موجود نہ تھا۔ دادی برتن صاف کر رہی تھی جلدی میں اٹھی اور چارپائی بچھا دی۔ لمبردار نے کہا "چاچی! دھنپت

گواہی سے ڈرتا تھا۔ کہنے آیا ہوں کہ میں نے اس کا پنڈ چھڑا دیا۔ دیکھنا! وہ گاؤں کی بدحالی دیکھ کر اداس ہو گیا ہے۔ زمین بیچ رہا ہے۔ کہتا ہے امرتسر چلا جاؤں گا۔ مزدوری کر کے پیٹ پال لوں گا۔ خیر اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ محنت اچھی، بھیک بُری۔ مگر کہاں زمینداری کہاں مزدوری! اسے سمجھانا گھر بار چھوڑنا اچھا نہیں۔ اگر جانا ہے تو چاؤ نکال لے۔ اس کی غیر حاضری میں زراعت کرا دوں گا۔ فصل تم لے لیا کرنا۔ طبیعت سنبھل جائے گی تو آپ سے آپ واپس آ جائے گا۔ شہروں میں بسنا آسان نہیں۔ دیہاتیوں کو تو وہ چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔"

دادی نے کہا "ہاں بیٹا! تم سچ کہتے ہو، دیہاتیوں کی شہر میں مٹی خراب اور میں اسے مزدوری کیوں کرنے دوں گی۔ غازی کی اولاد اور ٹوکری ڈھوئے! خاندانی ہو کر کمین کہلائے۔ ! ہاں بیٹا! میں اسے سمجھا دوں گی۔ تم بڑے بھائی ہو۔ پیار دلاسے سے تسلی دینا۔ تمہارے کہنے سے باہر تھوڑا ہے۔" لمبردار نے کہا "ہاں چاچی! ضرور کہوں گا۔" ماں گھونگٹ نکالے اوٹ میں کھڑی تھی۔ لمبردار نے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئی۔ لمبردار نے مخاطب ہو کر کہا "مایا! تو بھی سمجھانا۔"

ماں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دادی بولی "یہ بیچاری کیا سمجھائے گی؟ اسے تو بات کا بھی ڈھنگ نہیں، اپنی بھی سدھ نہیں۔ میں کان کھینچوں گی، بیٹا! بے فکر رہ۔"

لمبردار مطمئن گھر لوٹ آیا۔ لمبردارنی راہ تک رہی تھی۔ ترشرو ہو کر پوچھا

"کیا بات ہے۔ دھنپت سے گاڑھی چھن رہی ہے۔ کبھی وہ اِدھر اور کبھی تم اُدھر سنبھل کر رہنا، میٹھی چھری ہے۔ بہت خطرناک، اس کی ماں بڑھیا آفت کی پُڑیا! بڑی گھاگ، پرلے درجے کی خائنہ، کئی سَو روپے کھا گئی۔ اس کی جورو پگلی شراپن، اس کا بیٹا فتنہ، آتش کا پرکالہ۔ صاحب سے مفت میں پچیس روپے اینٹھ لایا ....." لمبردار نے بات کاٹ کر کہا "بھاگوان! آگ نہ اگل، لعل اگل۔ اجلے منہ میں زہر نہ گھول، وہ بیچارہ تو زمین بیچنے آیا تھا"۔

لمبردارنی کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً بات بدل گئی۔ اور کہا "اچھا! میں نے تو سنا تھا کہ عیسائیوں کی مدد کے لئے تمہیں اکسا رہا ہے۔ چلو ہمیں کیا؟ 'تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو' اچھا ہے تو اپنے لئے، برا ہے تو ہمیں کیا! کتنے روپے مانگتا تھا، لے لینی تھی اگر سستی ملتی ہے تو"۔

لمبردار نے کہا "میں نے تو انکار کر دیا"۔

لمبردارنی سٹپٹائی اور حیران ہو کر کہا "ہیں! انکار کر دیا؟ ہوش کے ناخن لو! زمین کہیں ملتی ہے ان دنوں اتنا ہی ہے تو میرے روپوں سے رہیش کو لے دو"۔

لمبردار پہلے تو خاموش رہا پھر جی کڑا کر کے بولا "بھاگوان! باپ بیٹے میں کیوں پھوٹ ڈالتی ہو۔ "میرے تیرے" اور "تیرے میرے" کا فرق کیوں پیدا کر رہی ہو؟ میرے نام کی زمین بھی تو رمیش ہی کی ہے۔ اگر رمیش کو علیحدہ کرنا ہی ہے تو تیری مرضی۔ پہلے یہ زمین بانٹ دے تاکہ ہم الگ الگ ہو جائیں۔ پھر جو چاہے کر لینا مجھے عذر نہ ہوگا"۔

لمبردارنی شرمندہ ہوگئی اور یہ کہتے ہوئے کہ "ہنسی مذاق کی بھی برداشت نہیں، کہاں جاؤں۔ میری بات بھی کڑوی لگتی ہے" اٹھ کر زنان خانے میں چلی گئی۔

گاؤں بھر میں بات پھیل گئی کہ دھنپت زمین بیچ کر امرتسر جا رہا ہے دادی سب سے لڑتی جھگڑتی کہ "کیوں جھوٹ بکتے ہو ہمیں زمین بیچنے کی کیا ضرورت ہے؟" آخر تنگ آ کر ایک رات آبدیدہ ہو کر بیٹے سے کہا "دیکھ بیٹا! میں جیتے جی تیرے باپ کی مڑھی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میری ڈولی یہیں آئی تھی۔ میری ارتھی (جنازہ) تیرے کاندھوں پر یہیں سے اٹھے گی"

باپ چونک اٹھا اور دادی کے آنسو پونچھ کر کہا "اماں فکر نہ کر! تیرے حکم سے پرے تھوڑے ہوں، دکھی ہو گیا تھا۔ بات منہ سے نکل گئی، معاف کر دینا" یہ کہہ کر پاؤں پڑ گیا۔ دادی نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور سر چوم کر کہا "دھنپت بیٹا! ہزاری عمر ہو، مرادیں پاؤ میری یہی اسیس (دعا) ہے۔"

ماں نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے باپ کے پہلو میں آ کر کھڑی ہو گئی جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

میں دو دھا اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ باپ صبح چھوڑ آتا چھٹی ہوتے ہی لڑکوں کے ساتھ کھیلتا کودتا واپس آ جاتا۔ لکھی کی یاد اکثر ستاتی۔ تصور ہی میں اس سے باتیں کر لیتا۔ دادی دو پراٹھوں کے ساتھ کبھی اچار کبھی آلو کی ترکاری کبھی بھجیا کبھی کوئی اور سالن باندھ دیتی۔ بھوک لگتی تو کھا لیتا۔ دو پیسے بھی مل جاتے تھے اسی سے پکوڑے یا مرمرے خرید لیتا۔ رات کو دونوں بھائی کھا پینے

کبھی کبھی دادی بھی شریک ہو جاتی۔ لکھمی میرے انتظار میں رہتا جب مدرسے کے پاس سے میں مولوی صاحب کو سلام کر کے گذرتا تو آنکھیں چار ہو جاتیں مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل جاتا۔

ایک دن اسکول سے آیا تو دادی بیمار تھی۔ پہلے تو کسی نے توجہ نہ دی۔ باپ آتا تو اٹھ بیٹھتی۔ مگر بخار کی شدت اور چھاتی کے درد نے ایک دن اٹھنے نہ دیا باپ گھبرایا حکیم کو لے آیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ دوا دارو کے باوجود بخار اور درد بڑھتا گیا۔ حکیم نور الدین ہمارے علاقے کے مشہور طبیب تھے انہیں خان والی سے بلایا۔ دو روپے فیس دی انہوں نے غور سے دیکھا تشخیص کی "ذات الجنب" ہے اور فرمایا "کوئی بات نہیں ٹھنڈ کھا گئی ہے"۔ لیپ اور کھانے کی دوا دی اور مزید کہا "زندگی اور موت خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے"۔ "لیجئے آیا آپ نام دھرایا تاپ معالجہ شرط ہے۔ قوتِ مدافعت کمزور ہے، بڑھاپا بھی ہے، خبر دیتے رہنا"۔ دادی کا بس چلتا تو دو روپے جھپٹ لیتی۔ آزردہ ہو کر کہا "بے کار کیوں دولت لٹا رہے ہو" اور کھانسنا شروع کر دیا۔ باپ نے دادی کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں دھنس گئی تھیں اور سانس اکھڑا ہوا تھا۔ باپ نے پن (خیرات) کروانا شروع کر دیا۔ جب کمزوری بڑھ گئی تو بہو بیٹے کو بلا کر دادی نے کہا "میرے پاس چار سو ساٹھ روپے ہیں۔ تین سو ساٹھ کوٹھڑی کے دائیں کونے میں، سو روپے تھیلی میں اس طرف، انہیں نکال لاؤ"۔

باپ نے کہا "اس تردد کی ضرورت نہیں، تم کو ابھی لکّو کا بیاہ دیکھنا ہے دان پن کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ پرماتما کے نام پر دینے سے کلیان ہوتا ہے

اگر سورج دیوتا کو پانی نہ ملے تو بارشیں کہاں سے آئیں"

دادی نے کہا "نہیں ! اب تو مجھ سے اٹھا بھی نہیں جاتا۔ سانس بھی رُکتا ہے۔ اچھا ہے تمہارے کندھوں پر چلی جاؤں۔ یہی میری تمنا تھی۔ اب پوری ہو گئی۔ تم میرا کہا کرو۔!"

باپ نے بادلِ ناخواستہ کُھرپے سے زمین کھودی، ایک کونے میں تین سو نوّے اور دوسرے میں سو روپے تھے۔ دادی نے کہا "میں بھول گئی تھی، اتنے ہی تھے۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے گن کر تین سَو پچاس علیحدہ کر دئے اور کہا۔ "یہ نکّو کے بیاہ کے لئے ہیں" یہ کہنا تھا کہ سب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "چالیس روپے میرے کریا کرم کے لئے، ہردوار ضرور جانا۔ راکھ راوی میں ڈال دینا۔ یہ بھی ہماری میّا ہے۔ سنسکار اپنے باپ کی مڑھی کے بائیں طرف کرنا۔ سَو روپے نہالی کو دے دینا۔ اس کا دینا ہے۔" میرا باپ یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ ادھر اسے غش آ گیا۔ اور دادی نے پران (سانس) تج (چھوڑ) دئے۔ باپ ہوش میں آیا تو دادی مر چکی تھی گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں حیران و ششدر رہ گئی۔ دادی کا مر جانا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آتا تھا۔ وہ دیر تک اپنے خیالات میں ڈوبی رہی۔ پھر چونک کر مجھ سے پوچھا "نکو تیری دادی سرگباش ہو گئی ہے کیا؟" میں نے کچھ جواب نہ دیا اور روتا رہا۔ باپ نے دادی کی وصیّت کے مطابق سنسکار کر دیا۔ پھول ہردوار لے گیا اور راکھ راوی میں ڈال دی مگر میاں بیوی سو روپے سے متعلق خاموش رہے آنکھیں ملتیں تو نگاہیں پھیر لیتے !

کریا کے دن باہر سے رشتہ دار بھی آئے تھے، جن میں میرا ماموں بھی تھا رام نانند شرما۔ دبلا پتلا۔ اس کی شکل کچھ کچھ ماں سے ملتی تھی۔ دھیما اور خاموش، ماں کی طرح۔ بہن بھائی دیر کے بعد ملے تھے۔ گلے مل کر خوب روئے اور رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ ماں بار بار اس کے بچوں کے متعلق پوچھتی رہی۔ وہ ہمارے لیے طرح طرح کے کھلونے کپڑے اور مٹھائیاں لایا تھا۔ ایسی کہ ہم نے پہلے نہ دیکھی تھیں۔ وہ تین دن کے بعد چلا گیا۔ ہم اسے پٹن تک چھوڑنے گئے بہن بھائی کا بچھڑنا بڑا ہی دلسوز اور دردناک منظر تھا۔ آنسو نہ تھمتے تھے۔ باپ کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ لکھتی سے میرا پیار کوئی نرالی بات نہیں۔ قدرت نے ماں جایوں کی تخلیق ہی میں یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر اس طرح بھر دیا ہے کہ زندگی کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ "تخلیق کی نوعیت" کہ ایک ہی مٹی، ایک ہی مسالے اور ایک ہی سانچے سے ان کا ظہور ہوا، ظاہر کرتی ہے کہ مشیّتِ ایزدی یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کریں اور ایک دوسرے پر جان چھڑکیں۔

پروفیسر دولت رام نے کہا "دوست! دادی کے مرنے کے بعد گھر کا نقشہ بگڑ گیا۔ ترتیب تنظیم اور آراستگی ختم ہو گئی۔ ماں خانہ داری کا بوجھ سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ یا یوں سمجھو کہ دادی نے اسے ناکارہ بنا دیا تھا۔ دادی کا رعب اب بھی اس پر چھایا ہوا تھا۔ وہ سوکھی سہمی رہتی۔ کام کاج میں باپ کو بھی ہاتھ ہٹانا پڑتا۔ کبھی روٹیاں بڑھ جائیں تو باسی کھانی پڑتیں۔ گھٹ جائیں، تو بھوکا رہنا پڑتا۔ سالن پڑا پڑا اُبس جاتا تو پھینکنا پڑتا۔ کبھی یہ ہوتا کہ اسکول کے وقت تک آگ نہ سلگتی۔ اور مجھے خالی پیٹ جانا پڑتا۔ مگر کسی کے لب پر حرفِ شکایت نہ آتا۔ بلکہ ترس آجاتا کہ بیچاری کس مصیبت میں پھنس گئی۔ اگرچہ وہ مختارِ کل تھی مگر اس میں کسی کام کے شروع کرنے اور اسے انجام تک پہنچانے کی صلاحیت نہ تھی۔ وہ ہر بات میں میری یا باپ کی دست نگر رہتی اور ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتی۔ ہمسائے میں اگر کوئی اونچا بولتا تو بھاگ کر اندر چلی جاتی

کریا کے آٹھ دس دن بعد باپ نے جی کڑا کر کے کہا "ننکو کی ماں! ذرا لانا

سو روپے نہالی کو دے آؤں۔" ماں کانپ اٹھی جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ اور توقف کے بعد ادھر ادھر جھانک کر بولی "میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اچھا کیا یاد دلا دیا۔ دھرم کے کام میں لگا دو گڑے مردے کیوں اکھاڑتے ہو۔؟ ورنہ جو تم چاہو"

باپ نے کہا "تیرا کہنا مانوں تو خیانت قائم رہی اور ماں کا کہنا بھی نہ ہُوا"

ماں نے دھیرے سے کہا "بات پھر جاگ اٹھے گی۔ لوگ جان کھا جائیں گے دان پن ہی تو کرنا ہے کر دو، کیا فرق پڑتا ہے؟"

باپ نے کہا "باغیچی والے آم کو پانی دینے سے یہ ساتھ والی بیری کیسے ہری ہو جائے گی؟ مجھے بتا"۔ ماں نے ساتھ والی بیری کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اپنی انگلیاں چٹخانا شروع کر دیں۔ اور خاموش ہو گئی۔

باپ نے کچھ تامل کے بعد کہا "پھر لا دو! یہ جھنجھٹ بھی ختم ہو جائے۔"

وہ اٹھی پھر بیٹھی اور کہا "سوچ لو! بدنامی ہو جائے گی۔ نتیجہ ٹھیک نہیں نکلے گا۔" باپ نے کہا "نکو کی ماں! سوچ لیا، جو اس دھوکے میں رہا ٹوٹے میں رہا۔ جوانی کے دنوں کی بات ہے کہ میں نے سنگرالی والے کھیت کو کئی بار کھرپے سے صاف کیا گھاس اور تنکے تک کا نشان مٹا دیا۔ پھر تین بار ہل چلایا۔ مٹی کو سرمہ بنا دیا کہ آنکھوں ڈالی نہ چبھتی تھی۔ بڑھیا کھات ڈالی۔ دوہرے کنوئیں کو صاف کیا برہا کو ڈھانپ دیا تاکہ فالتو تنکا بھی نہ جا سکے اور کھیت کی مناسب طریقے سے آبیاری کی اور چنے کا بیج بو دیا اور یہ امید لگا بیٹھا کہ محنت، احتیاط اور شدتِ شوق اور فضلِ الٰہی سے چنے کے بجائے گندم اُگ آئے گا۔ مگر دیکھا تو چنے ہی اُگے۔ سہواً کچھ دانے گندم کے بھی پڑ گئے

تھے وہ گیہوں بن کر ہی اٹھے - ان پر ماحول کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گناہ کا بیج بو کر نیکی کے پھل کی امید رکھنا محض حماقت ہے - امانت روک لیں تو نتیجہ اچھا کیونکر ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" ماں کو باپ کی جوانی اور اپنے اوائل یاد آ گئے۔ وہ کچھ کھوئی سی گئی۔ جماہی لی، اٹھ کر اندر چلی گئی اور سو گئی۔

باپ دادی کی عزت کرتا تھا۔ اس کے ہوتے گھر کا کوئی فکر نہ تھا۔ وہ باشعور، وقت شناس اور کفایت شعار عورت تھی۔ مشکل سے مشکل الجھن کو سلجھا لیتی۔ گاؤں کی عورتیں اس سے دبتی تھیں۔ وہ زبان کی میٹھی تھی۔ وقت پر کڑوی بھی ہو جاتی۔ پاکدامن اور اپنے عقیدے کے مطابق خدا پرست تھی۔ مگر اس موقع پر سو روپے کی خیانت میرا باپ نہ سمجھ پایا۔ وہ اس کی بڑائیوں اور خوبیوں سے متاثر تھا۔ جب خیانت کا خیال آتا تو جی برا ہو جاتا۔ وہ اس صدمے کو بھولنے کی کوشش کرتا مگر دن چڑھتے ہی دادی خائنہ بن کر اس کی چشم تصوّر کے سامنے آجاتی۔ وہ کانپ اٹھتا۔ آنکھیں بند کر لیتا اور گھبرا کر باہر چلا جاتا۔ کھیتوں میں یا درختوں تلے۔ مگر یہ خیالات وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ پتّا پتّا بوٹا بوٹا، ہوا کا ایک ایک جھونکا اسے "خائنہ کا بیٹا دھننت! خائنہ کا بیٹا دھننت" کہتا سنائی دیتا۔ باپ انتہائی ذہنی کوفت میں تھا۔ اور ماں اسکے جذبات سے ناآشنا یا غافل! وہ اس واقعہ کو اپنے ذہن سے اتار چکی تھی۔ اور مطمئن ہو گئی تھی کہ اس پر ہمیشہ کے لئے پردہ پڑ چکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس پر رضامند تھی کہ روپے دیوی دوارہ یا مندر میں چڑھا دیے جائیں تاکہ غبن بھی چھپا رہے اور نام بھی ہو جائے۔ مگر اس میں نہ تو صلاحیت تھی نہ سلیقہ کہ باپ کو اپنے

ڈھنگ پر لاسکتی ۔ وہ دل ہی دل میں منصوبے باندھتی اور بے فکر ہو کر بیٹھ جاتی اور اس خیالِ خام میں رہتی کہ وقت کا پاٹ آپ سے آپ معاملے کو ہموار کر دے گا۔

ماں تو نچنت ہو بیٹھی مگر باپ کو اطمینان کہاں ؟ اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی ۔ ماں کو کیا معلوم کہ باپ پر کیا گذر رہی ہے ۔ وہ بے خبر، بے پروا، بے نیاز تھی ۔ باپ آئینے میں منہ دیکھتا تو شیطان جھانکتا دکھائی دیتا ۔ چلتا تو سائے سے ڈر لگتا ۔ کوئی آواز دیتا تو گھبرا اٹھتا ۔ پتوں کی سرسراہٹ ، پرندوں کے چہچہوں ، رہٹ کی گھوں ایں گھوں ایں میں اسے "خائنہ کا بیٹا دھنپت" کی گونج سنائی دیتی ۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی ۔ حسینا گوجر اس کا لنگوٹیا یار تھا ۔ ایک دوسرے کے کام آجاتے ۔ باپ ڈگ بھرتا جا رہا تھا کہ اس نے آواز دی "دھنپت ! ذرا ٹھہرنا تجھے کچھ کہنا ہے " پہلے تو وہ رکا مگر پھر چل پڑا ۔ اس نے دوڑ کر دامن پکڑ لیا اور تھام کر کہا " ماں باپ کا مرنا سنت ہے وہ سدا کس کے سر پہ جئے ۔ غم و اندوہ چھوڑو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کا دھیان کرو ۔ وہ اپنی بری بھلی نباہ گئے ۔ تمہارے رونے دھونے سے واپس نہ آئیں گے" ۔ باپ نے پلا چھڑا کر بھاگنا چاہا مگر اس نے جانے نہ دیا ۔ اور کہا " بال باندھا غلام ہوں ، غیر نہیں ، تیری حالت دیکھی نہیں جاتی ۔ کیا بات ہے صاف صاف بتا ؟ باپ نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "بات بتانے کی نہیں "

حسینا نے گھبرا کر کہا "بیوی کی بے وفائی ؟"

باپ نے کہا " وہ تو دیوی (فرشتہ سیرت) ہے

حسینا کھل کھلا کر ہنس پڑا اور باپ کو پہلو میں لگا کر کہا " دوست! غم نہ کھا، بیوی کی بے وفائی کا علاج " موت کے جھٹکے " کے سوا ممکن نہیں۔ دوسری کلفتوں کا علاج آسان ہے۔ دکھ تا ابھی درماں بنائے دیتا ہوں "

باپ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا " ماں کی خیانت "

حسینا نے کہا چھوڑ یار! وہ خائنہ کب نہ تھی۔ تیری خود فریبی! یا یوں سمجھ تیری محبت تھی کہ تو نے اسے خائنہ نہ سمجھا ورنہ کون نہیں جانتا کہ اس نے نہا کی امانت میں خیانت کی "

باپ نے کہا " میں خائنہ کا بیٹا بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتا "

حسینا نے کہا " پھر وہی بات۔ بھول گئے کیا؟ تمہیں نے تو کہا تھا لمبر دار میرا لگان مجھی سے مانگے گا کسی اور سے نہیں۔ ماں نے جنم دیا قابلِ تعظیم ہے مگر اس کی کرنی اس کے ساتھ۔ وہ آپ بھرے گی۔ اگر سکت ہے تو روپیہ بھر دو خائنہ کا بیٹا نہ کہلاؤ "

باپ نے کہا " ماں بھی یہی کہہ گئی تھی مگر بیوی ہچکچاتی ہے۔ بدنامی سے ڈرتی ہے کہتی ہے مندر میں چڑھاوا دے دو اور خائنہ کا بیٹا بنے رہو۔"

حسینا نے کہا " دوست اسے چھوڑو! ابھی روپے لاتا ہوں چپکے سے دے آؤ۔ اور سرخرو ہو جاؤ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور کوفت مٹ جائیگی "

باپ نے کہا " اگر پتہ لگ گیا تو! "

حسینا نے جواب دیا " پھر کیا ہُوا ؟ گھر سے تو نہ نکال دے گی مرنے سے تو بہر حال بہتر ہی رہے گا۔ یہی صورت رہی تو چار دن بھی نہ کاٹو گے "

حسینا روپے لے آیا اور باپ کے ساتھ ہو لیا۔ نہالی چرخہ کات رہی تھی اور اس کی بہو بچے کو نہلا رہی تھی۔ باپ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سنبھل کر بولی " بیٹا دھنپت ! تم ! تیرا آنا سر آنکھوں پر ! بیٹھ جا ! تیری ماں میری بہنیلی سہیلی تھی۔ بیچاری مر گئی۔ روپے نے بگاڑ ڈال دیا۔"

باپ نے کہا " روپے لے کر آیا ہوں۔ دینے کو کہہ گئی تھی۔"

اس نے روپے گن کر رکھ دیئے اور کہا " بیٹا ! جیٹھی کی نیت خراب نہ تھی ہونی ہو کر رہی تمہارا باپ بیمار تھا بیچارہ سرگباش ہو گیا۔ بیماری میں روپے اٹھنے تو ہیں ہی۔ اتنیس ان میں سے گھٹ گئے۔ میں نے مانگے اس نے سچ سچ کہہ دیا اور مہلت مانگی۔ میری مت ماری گئی۔ میں نے گاؤں اکٹھا کر لیا۔ وہ ہجوم کا سامنا نہ کر سکی، مر گئی "۔ بہو کو مخاطب کر کے کہا " بہو دیکھ لے ! تجھے کہا کرتی تھی نا ! اس کی نیت خراب نہ تھی۔ دیکھ میری بات سچ نکلی۔"

نہالی نے باپ کو اسیس (دعا) دی۔ وہ اور حسینا واپس آ گئے۔ باپ نے باپ کی گٹھڑی سر سے اتار پھینکی اور سرخرو ہو کر واپس آ گیا۔ اور سب سے بڑھ کر خوشی اسے یہ ہوئی کہ دادی کے متعلق بدگمانی دور ہو گئی۔ روپے دے کر اطمینانِ قلب خرید لایا۔

باپ کے آنے سے پہلے ہی ماں کو، بلکہ سارے گاؤں کو پتا لگ چکا تھا کہ باپ سو روپے دے آیا ہے۔ نائن بھاگی بھاگی آئی اور ماں کو بھی کہہ

گئی "سنا تو نے اندھیر ہو گیا؛ آپ سے آپ چور بن آیا۔ پاؤں پڑ کر روپے دے آیا۔ بدلے میں سو سو صلواتیں پلّے باندھ لایا۔ شکر ہے جان بچ گئی۔ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا تھا۔ اگر حسینا ٹھنڈا نہ کرتا تو عجب نہیں جان ہی گنوا بیٹھتا۔ ماں سن کر گم صم ہو گئی۔ اور کواڑ بند کر کے بیٹھ گئی۔ دریں اثنا عورتوں کا ہجوم ہو گیا۔ اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگا۔ باپ کو دیکھا تو منتشر ہو گیا۔ باپ سمجھ نہ پایا کہ کیا معاملہ ہے۔ کواڑ بند تھے۔ دستک دی تو دروازہ نہ کھلا۔ گھبرا کر آواز دی تو ماں تھوڑا سا کواڑ کھول کر اندر چلی گئی۔ روتے روتے اس کی آنکھوں پر سوجن پڑ گئی تھی۔ باپ نے دلاسا دے کر پوچھا "کیوں؟ کیا معاملہ ہے" اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ سو روپے لا کر اس کے آگے رکھ دئے باپ نے نہ کی بات پالی۔ مگر حیران تھا کہ اتنی جلدی کیونکر پھیل گئی۔ حسینا کے پاس گیا اور روپے اسے دے دئے۔

حسینا نے پوچھا "کیا بھابی کو بتا دیا؟ اچھا کیا!"

باپ نے کہا "وہ آپ ہی جان گئی۔ حیران ہوں کیونکر؟"

حسینا سوچنے لگا اور کہا "سمجھ گیا۔ نائن کی کرتوت ہے۔ اسے گاؤں میں دیکھا تھا۔"

باپ نے آزردہ ہو کر کہا "ماں جیتی تھی تو عورتوں سے نمٹ لیتی تھی۔ اس سے نمٹا نہ جائے گا۔ صرف رونے پر زور ہے۔ کواڑ بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔"

حسینا نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "ٹھنڈی پڑ جائے گی تو بات آئی گئی ہو جائے گی فکر نہ کر" باپ نے آہ سرد بھر کر کہا "گھر میں معمولی تلخی ہو

تو بدمزگی ہو جاتی ہے کھٹ پٹ ہو تو خانہ داری تباہ ہو جاتی ہے مگر تمہیں بتاؤ کہ بہرا گونگا بنے رہنا اور اجنبی سا ہو رہنا۔ کیا یہ ناقابلِ برداشت نہیں؟"

مولوی صاحب کو آتے دیکھ کر باپ چپ ہو گیا۔ وہ گھوڑی سے اتر آئے اور گرمجوشی سے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "بھائی دھنپت! تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ مبارکباد دینے کے لئے۔ تم نے اپنے لئے جنت میں جگہ بنا لی اور ماں کو بھی بچا لیا۔ تم سپوت ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔" باپ نے سر جھکا دیا اور مسکرا کر کہا "مولوی جی! لوگ تو جینے نہیں دیتے۔ ماں کی نیت صاف تھی۔ حالات نے یہ صورت پیدا کر دی۔ آپ نے کہہ کر ڈھارس بندھا دی ہے......"

مولوی صاحب نے بات کاٹ کر کہا "ان پر ترس آتا ہے وہ ناحق دوزخ میں جگہ بنا رہے ہیں"۔ باپ گھر آیا تو کواڑ بند پائے چند عورتیں دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔ آواز دی تو لکھمی نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ باپ کو دیکھ کر رو پڑا۔ باپ نے دلاسا دیا۔ کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ کھانا کھایا۔ ہمیں کھلایا اور پڑ رہا۔ ماں زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔ چلتی پھرتی لاش تھی، بہری گونگی کہتی نہ کچھ سنتی۔ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ باپ نے دو تین بار اٹھ کر پوچھا تو ہولے سے کہا "کچھ نہیں سو رہو۔ بے آرام کیوں ہوتے ہو"

باپ کو نیند کہاں؟ منہ اجالے اٹھ بیٹھا اور ماں کی کھاٹ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ باپ دیر تک ٹکٹکی لگائے اُسے

دیکھتا رہا۔ اگرچہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ ایک لاش تھی یخ کی طرح سرد۔ مردہ امیدوں اور آرزوؤں کا مدفن، ساس کے ناجائز دباؤ اور خاوند کی بے اعتنائیوں کا شکار۔ بچوں کی اموات اور زمانے کی بیگانگی نے اسے اپنے آپ سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ وہ عہدِ ماضی کی یادگار تھی حال سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے اپنی ذات کو گمنامی کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی خواہشیں اور تمنائیں مر چکی تھیں۔ اور ان کے ماتم میں سوگوار رہنا ہی اس نے مقصودِ حیات بنا رکھا تھا۔ باپ کو وہ دن یاد آ گیا کہ وہ دولہا بن کر گیا تھا اور اسے بیاہ کر لایا تھا۔ مسرتوں اور شادمانیوں سے ہمکنار کرنے کے لئے۔ رفیقۂ حیات اور گھر کی ملکہ بنانے کے لئے۔ اس وقت وہ توانائی، تندرستی اور رعنائی کی تصویر تھی، سراپا دلکش اور زہد شکن مورت اور اب ......؟ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے اور گھگھی بندھ گئی۔ ماں چونک کر اٹھی اور استعجاب سے کہا "روتے ہو! کیوں؟ کیا مرنے والی ماں یاد آ گئی!"

باپ سنبھل نہ سکا اور سر تھام کر اس کی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ کھاٹ سے اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "کہو تو آخر ہوا کیا؟"

باپ کے آنسو نہ تھمتے تھے اور منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اس کا توانا جسم بیدِ مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا "تمہیں دیکھ کر! تمہیں دکھی دیکھ کر"۔ وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح جھلائی۔ قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور دانت پیس کر کہا "دکھی نہ ہوں، تیری

گھر والی ہوں ۔ لونڈی سے بدتر۔ تو نے بیوی کب جانا۔ صرف اپنے بچوں کی ماما سمجھا۔"

باپ چپ ہو گیا ۔ اگرچہ آنسو بند تھے ، وہ ندامت کے پسینے میں شرابور تھا۔

"اب کیوں چپ ہو گئے" وہ چلّائی "مجھے بتایا تک نہیں چپکے سے روپے دے آئے ۔ بھلا میں کیا لگتی تھی ۔ دنیا پیچھے پڑ گئی ، جان پر بن گئی ، رو رو کر ہلکان ہو گئی ہوں ! تیرا کیا بگڑا ؟"

باپ نے ماں کی طرف غور سے دیکھا۔ خود داری اور خود اعتمادی کا احساس اور پرزور مظاہرہ بالکل نئی چیز تھی ۔ اس نے ہتھیار ڈال دئے اور ہار مان لی ۔ اور محبّت آمیز الفاظ میں مسکرا کر کہا "آیندہ تیرے بغیر تنّا نہ ہلے گا۔ جو تو کہے گی وہی ہو گا پچھلی باتیں بھول جا ۔"

"تو میں یہاں نہ رہوں گی ۔ اس گندے ماحول میں" اس نے کہا۔

باپ نے ہنس کر جواب دیا" ایسا ہی ہو گا تو فکر نہ کر"

اس کے بعد گھر کی کایا پلٹ ہو گئی ۔ ماں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ۔ وہ دن بھر کام میں لگی رہتی اور نہ تھکتی ۔ اس کا چہرہ کھلا رہتا ۔ بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے ۔ اور ہمارے گھر کا صحن کشتِ زعفران زار بن جاتا ۔ خوشحالی ہماری باندی بن گئی اور خوش بختی ہماری چاکر۔ ایک دن باپ نے حسینا سے کہا" دوست ! میری بڑھیا اجیرن بن گئی تھی ، جان کا روگ ۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ۔ نئی لے آیا ہوں ۔ آ تجھے دکھاؤں !"

وہ حسینا کو گھر لے آیا۔ گھر کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ باہر کی دیواریں پوتی ہوئی تھیں۔ آنگن صاف ستھرا تھا چیزیں قرینے سے دھری ہوئی تھیں۔ بولا "واہ بھائی! مگر نئی گھر والی؟" ماں سامنے آئی تو چہرہ پُر وقار تھا۔ لالہ رُخ تھی شگفتہ و شاداب۔ ماتھے پر بندی تھی، مانگ میں سیندور آنکھوں میں کاجل، دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور لب فندق کی طرح لال تھے۔ کپڑے اگرچہ سادہ تھے مگر اجلے اور صاف۔ ان میں بھی ایک پھبن تھی، ایک سج دھج۔ وہ حیران رہ گیا۔ اور استعجاب میں کہا "ہیں بھابی! تو!" ماں جھینپ کر اندر بھاگ گئی۔ بھاگنے میں دلربائی کے سینکڑوں انداز چھپے ہوئے تھے۔ حسینا نے پوچھا "یہ کیونکر ہوا؟" باپ نے ہنس کر کہا "پھر بتاؤں گا، ابھی تو ابتدا ہے، آغاز ہے نئی زندگی کا"

گھر کی چہل پہل سج دھج دیکھ کر گاؤں والے جلنے لگے۔ مگر ماں سب کی سنتی سب کے دکھ درد میں شریک ہوتی۔ ہمارے گیتوں اور بھجنوں میں شامل رہتی۔ آپ ہنستی ہمیں ہنساتی۔ خود خوش رہتی ہمیں خوش رکھتی۔ سوکھی روٹی میں بھی ہمیں دودھ بالائی کی لذّت آتی۔ ماں کی محبّت کیا نعمت ہوتی ہے اس کا اندازہ ہمیں اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ مگر اب اس کی ہر ادا نورانی شعاعوں کی حامل تھی جو ہمارے سینوں کو منور کر رہی تھی۔ چاند کی چاندنی تھی کہ کلیجے کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ خضرِ راہ تھی کہ کامرانی کا راستہ دکھا رہی تھی۔ ماں ایک قابلِ فخر ہستی بن گئی تھی۔ لاثانی، نورانی، جاودانی!

باپ کی قوتِ کار بڑھ گئی۔ اس کی رفتار و گفتار میں فرق آ گیا۔ اس

کی وضع قطع بدل گئی ۔ اب وہ ایک نئی منزل کا راہی تھا ۔ ایک نسوانی ہاتھ اس کی رہبری کر رہا تھا ۔ ایک عورت اس کی خداوند تھی جو اس پر حکومت کرتی تھی، اس کی محکوم بن کر، اس کی پیشوا تھی اس کے پیچھے چل کر!

باپ نے کہا "ایشر کا خط آیا ہے کہ مکان خالی ہو گیا ۔ کب چلنے کا ارادہ ہے ۔ ؟"

ماں نے کہا "پھر ہو آؤ"

باپ نے جواب دیا "اکیلا نہیں جاؤنگا ۔ تم ساتھ چلو تو جگہ پسند کر لو"

ماں بولی "رہنا ہی تو ہے (باپ کی طرف اشارہ کر کے) مکین اچھے ہوں تو مکان آپ سے آپ اچھا ہو جائے گا ۔"

باپ کے چہرے پر رنگ آ گیا اور مسکرا کر کہا "گھر والی تو تو ہی ہے، پھر مکان بھلا کیوں نہ لگے گا ۔ بیساکھی کا تہوار سال بھر میں ایک ہی بار آتا ہے تجھے دیکھوں تو ہر لمحہ ہی میرے لئے بیساکھی ہے ۔ تو میرے ساتھ ہی چل"

ماں نے کہا "بچے کہاں چھوڑوں ؟"

باپ نے کہا "فکر نہ کر، حسینا انہیں سنبھال لے گا"

ماں مان گئی ۔ اور دوسرے دن وہ دونوں ہماری خوابوں کی دنیا یعنی امرتسر روانہ ہو گئے ۔ چچا حسینا مجھے اسکول چھوڑ آتا اور لے آتا ۔ لکھی کو ایک دو بار دیکھ آتا ۔ اپنے گھر سے مکھن شکر لاتا اور ہمیں کھلا کر خوش ہوتا ۔ کتنا اچھا تھا ہمارا چچا حسینا!

ایشر داس، ہمارے ماموں کا ہم زلف تھا وہ امرتسر کا قدیم باشندہ تھا

اور کسی تجارتی ادارے میں منیم تھا۔ اس نے اپنے پڑوس میں مکان لے دیا۔ اشیر کی بیوی لاجونتی میری ماں کی سلجھی ہوئی طبیعت سے بہت متاثر ہوئی اور خوش تھی کہ اچھے ہمسائے مل گئے۔ اچھی نبھ جائے گی۔ مکان پسند آگیا۔ ماں اور باپ دونوں نے مل کر لیپا پوتی اور صفائی کرلی۔ باپ نے کرایہ نامہ لکھ دیا اور واپس آگئے۔ حسینا نے ماں کو مخاطب کر کے کہا "بھابی اپنے لڑکے سنبھال لے۔ دیکھ دو دن میں موٹے تازے کر دئے ہیں"

ماں نے کہا "بھائی بچے تیرے ہی تو ہیں، تیرے دوست کے بیٹے"

وطن کو چھوڑ دینے کا نام ہجرت ہے۔ ہم نے ہجرت اختیار کرلی۔ کتنا بھیانک اور ہولناک لفظ ہے کہ لرزہ آجاتا ہے۔ لمبردار یا تزا پر گیا ہوا تھا۔ پرانشرول میں کوئی خریدار نہ ملا۔ ناچار زمین حسینا کو دینی پڑی۔ گاڑی پر سامان لاد لیا۔ اور گاؤں سے چل پڑے۔ مولوی صاحب نے ہمیں وداع کہی اور پاس بلا کر کہا "دیکھو بچو! امرتسر کی زمین پھسلنی ہے۔ دیکھنا! اس پھسلنی زمین میں کہیں پھسل نہ جانا خدا حافظ"۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی تھے۔ شیخ، گوجر، پراشر، کمین عیسائی اور باپ کا خاص دوست حسینا بھی! بوڑھی لیلو غش کھا کر گر پڑی۔ وہ پسیائی کے لئے جنس لے آتی تھی، باپ پیسے دیتا۔ اس کا آسرا ٹوٹ گیا۔ من سکھ اپاہج کا کھانا بنا آتا، لبھو کی گائے دوہ آتا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اس کا اخلاص ہمہ گیر تھا۔ وہ مویشیوں سے محبت کرتا۔ کام کم لیتا، چارہ زیادہ دیتا۔ درختوں سے پیار کرتا۔ نئے لگاتا، آبیاری کرتا۔ کھیت سے پریت کرتا۔ ہل محنت سے چلاتا، کھاد اچھی ڈالتا۔ چیونٹیوں تک سے اُنس رکھتا۔ ان کے بلوں میں تل

چاول ڈال آتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے کوئی کتاب نہ لکھی نہ کوئی گہرا مسئلہ حل کیا۔ نہ کوئی ایجاد کی نہ روپے جمع کئے۔ اور نہ کوئی کارِ نمایاں انجام دیا وہ اَن پڑھ اور غریب کسان تھا۔ مگر اس کے وداع پر سینکڑوں آنکھیں نمناک تھیں۔ اور ہزاروں دل افسردہ۔ انسانی زندگی کا اس کے سوا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ میرے دوست! ذرا بتا!"

وہ خاموش ہو گیا اور جواب کے لئے میرا منہ تکنے لگا۔ میں اس کی روانی اور تسلسل میں حارج (رخنہ انداز) نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"تھوڑی دور تک بہت سے لوگ ہمارے ساتھ گئے اور لوٹ آئے مگر حسبنا نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ گاؤں کی حد پر پہنچے تو باپ نے گاڑی روک لی اور مڑ کر گاؤں کی سمت دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اداسی طاری ہو گئی وہ گاؤں سے بے غم کیسے جا سکتا تھا۔ دکھوں، تکلیفوں، مسرتوں اور شادمانیوں کا ایک زمانہ اس نے یہاں گذارا تھا۔ اسی آب و گل سے وہ اٹھا تھا۔ اس کے ماں باپ، دادا دادی اور بزرگوں کی مڑھیاں (مزار) حسرت سے اس کی طرف تک رہی تھیں۔ اس کے ننھے ننھے بچے یہیں پیوند خاک ہوئے تھے۔ وہ خلش اور دکھ کے بغیر ان سے کیونکر جدا ہو سکتا تھا۔! اگرچہ اس کی زبان خاموش تھی مگر اس کی روح بے قرار تھی تاہم بیوی کی دلجوئی میں اسے جانا ضرور تھا۔ اس لئے وہ ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ قدرت کی کارفرمائیاں اور انسان کی بے بسی! باپ نے صبر کی سِل چھاتی پر رکھی اور گاڑی آگے

ہانک دی۔ پھر تھما، پیچھے مُڑا اور کھیت میں سے (جواب اس کا نہ رہا تھا) مٹی کی ایک مٹھی اٹھالی۔ اسے بوسہ دیا اور ماں کو دے کر کہا "مکّو کی ماں! یہ خاکِ وطن ہے، متبرک، پاک، اسی مٹی سے ہم بنے ہیں اسے سنبھال لے یہ ہماری اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ بطور تبرک، بطور ورثہ محفوظ رہے گی"

ماں کا دل پاش پاش اور آنکھیں پُرنم تھیں۔ وہ گاؤں کی ٹھنڈی ہوا اور میٹھا پانی چھوڑے جا رہی تھی۔ اپنے آنسوؤں کا بے پایاں سمندر، اپنے ارمانوں اور حسرتوں کا مزار، اپنے متوفی بچّوں کی نشانیاں۔ مگر قدرت کا کھیل۔ اس کے قدم امرتسر کی طرف بڑھ رہے تھے۔! وہ روکنا چاہتی تھی مگر نہ رکتے تھے۔

حسینا حسرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر سنبھل کر بولا "دھنیت! میں کہوں تو نہ جا، میرے گاؤں میں بس جا۔ بدلے میں اس سے اچھی زمین لے لے"

باپ نے ماں کی طرف دیکھا اور کہا "ماحول خراب ہو رہا ہے۔ جی نہیں لگتا۔ لوگ درندے بن گئے ہیں۔ ماتا کہتی ہے کہ میرا نباہ نہ ہوگا۔ بچّے بگڑ جائیں گے۔ یہ وبا اب رکنے کی نہیں۔ گرد و نواح میں بھی پھیل جائے گی۔ یہ خیال نہ کر کہ تجھے بھول جاؤں گا۔ تیرے دکھ سکھ میں شریک رہوں گا۔ اب تو جا۔ بہت دور نکل آیا۔"

اس نے کہا "نہیں! دریا تک ضرور جاؤں گا۔"

وہ آگے چل پڑے۔ گو ان کی زبانیں بند تھیں مگر دل رو رہے تھے۔

اور آنکھیں پُر آب ہو رہی تھیں۔ جسٹر کا پُل پار کرنے کے بعد میرا باپ تھم گیا۔ اس نے دیکھا کہ دریا پایاب تھا۔ دریا میں بڑھ کر پانی کا ایک چُلو بطور تبرک لیا۔ آنکھوں پر چھینٹے دئے اور دو پیسے چڑھاوا دے کر الوداعی نمسکار کیا۔ پھر باہر آکر حسینا سے بغلگیر ہو گیا۔ اور دلگیر ہو کر کہا "اب تو جا! بہت دور نکل آیا۔ کام بگڑ رہے ہوں گے۔"

اس نے کہا "کام جو بگڑنے تھے سو بگڑ چکے ہیں تیرے جانے سے۔ گاڑی کا پہیا ٹوٹ گیا۔ پانی کو ریت نے چاٹ لیا۔ زندگی وبال ہو گئی۔ اب کیا رہ گیا خراب ہونے کو۔ امرتسر تک تیرے ساتھ چلوں گا تو مجھے نہ روک۔"

باپ نے کہا "نہیں اب آگے نہ جانے دوں گا"

وہ رکا، پگڑی میں سے ایک دستاویز نکالی اور کہا "یہ لے میرا دوستانہ ہدیہ۔ میں تیرا مزارع تابع مرضی رہوں گا۔ روپے جو دئے تھے وہ نذر سمجھنا۔ پردیس جا رہے ہو کام آجائیں گے"

یہ کہہ کر وہ دریا میں کود پڑا۔ اور یہ جا وہ جا آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ ماں اور باپ دونوں سکتے میں رہ گئے۔ سنبھلے کبھی تو یہ طے نہ کر پائے کہ اب کیا کرنا ہوگا۔ حسینا کے یہ الفاظ کہ "پردیس جا رہے ہو" ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کیا وہ دیس جا رہے ہیں یا پردیس۔ یہ کبھی وہ فیصلہ نہ کر پائے

ڈیرہ بابا نانک پہنچ کر ہم نے روٹی کھائی۔ بیلوں کو چارہ پانی دیا اور آگے چل پڑے۔ اگرچہ ہمارا سفر لمبا تھا۔ مگر ہم نے خاموشی اور سلامتی سے

طے کرلیا۔ لکھتی راستے کے ندی نالوں، پلوں، گاؤں اور بستیوں سے متعلق پوچھتا رہا۔ باپ کبھی بتا دیتا کبھی چپ رہتا۔ ہم نے کئی نئی چیزیں دیکھیں۔ کتابوں میں پڑھی ہوئی باتیں حقیقتیں بن کر ہمارے سامنے آگئیں۔ آخر ہم بٹالہ پہنچ گئے۔ رات چھا چکی تھی باپ نے گاڑی سڑک کے ایک کنارے لگا دی بیل کھول دئے اور ہم گاڑی میں سو گئے۔ رات بھر گاؤں کے خواب آتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وطن کا پتّا پتّا بوٹا بوٹا ہمیں واپس بلا رہا تھا اور اس کیفیت کی منہ بولتی تصویر بن گیا تھا ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

مگر ہمارے قدم امرتسر کی طرف تھے جو ہمارے سفر کی آخری منزل تھی!

اس نے کہا "اے دوست! اب آگے سُن۔ تیرا روم[1] ہوسِ ملک گیری کا نشان ہے۔ ایتھنز[2] ذہنی ارتقاء کے مدوجزر کا۔ مکہ[3] عقیدت وعبودیّت کا، دہلی پیہم انقلابات کا۔ مگر امرتسر کی شان نرالی ہے۔ یہ اس صوفی منش سوسائٹی کی یادگار ہے جو حضرت میاں میر اور ست گور (رہبرِ کامل) رام داس جی کی مشترکہ قیادت سے ظہور میں آئی۔ حضرت نے ہر مندر (ربّانی معبد) کی نیو ڈالی اور ست گور نے شہر بسایا۔ اور توحید، عبودیّت، مساوات اور رواداری کا سرچشمہ بہہ نکلا۔ لوگ جوق در جوق اپنی دینی و دنیوی پیاس بجھانے کے لئے یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ ہمارا حقیر اور مختصر سا قافلہ بھی اپنے پیشرو زائرین کی طرح دنیا کی منفعت اور عقبیٰ کی مغفرت کی تلاش میں اس گورو کی نگری میں داخل ہوا۔ امرتسر اور گاجی پور میں امرِ مشترک

---

[1] Rome [2] Athens [3] Mecca

یہ ہے کہ ہمارے راوی کا پانی اس کی نہر میں بہتا ہے ورنہ امرتسر یکسر علیحدہ اور مختلف چیز ہے۔ شہر میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سر بفلک عمارتوں کا شمار ہے اور نہ زمیں بوس جھونپڑیوں کی گنتی۔ گاجی پور کی یکسانی و یکسوئی یہاں مفقود ہے۔ عشرت و عسرت، فراغت و افلاس، نیکی و بدی قدم بقدم ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ یہاں عالم و جاہل، سنجیدہ و غیر سنجیدہ، متین و شوریدہ سر، معروف و غیر معروف مزدور و آقا، مفلس و سرمایہ دار، ہندو مسلمان سکھ عیسائی موسائی پارسی ہر عقیدے اور ہر طرح کے لوگ آباد ہیں۔ لوگوں کا ہجوم ایک بحرِ مواج نظر آتا ہے جس کی لہریں تھمتی دکھائی نہیں دیتیں۔ ٹھیلوں ٹانگوں یا ئیسکلوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور بچو ہٹو کی آوازیں ہر سمت سے آتی رہتی ہیں۔

ہمارے لئے تو شہر کی ہر ایک چیز انوکھی اور نرالی تھی مگر ملکہ اور نکلسن کے بُت، کمپنی باغ، درگیانہ مندر، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا محل اور ملحقہ فوّارے "ٹھنڈی کھوئی"، بابا اٹل اور سب سے بڑھ کر ہر مندر اور اس کا تالاب میں جھلملاتا عکس (جس کی تقدیس عظمت اور صناعی کا بیان بڑے سے بڑے شاعر مصوّر، صنّاع اور مغنّی کی دسترس سے باہر ہے) خاص طور پر جاذبِ نگاہ اور حیران کر دینے والا ہے اور اس وجدانی لطف و کیفیت کا مظہر ہے جس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ اور پھر جلیانوالہ باغ ہے جو زیارت گاہِ عالم بن گیا ہے اور جس سے متعلق بطور اظہارِ عقیدت شاعرِ مشرق نے دلسوزی سے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ　　غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے

سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم   تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

شہر کی زندگی بھی دیہات کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں ضرورت کی ہر شے میسّر ہے۔ تہذیب و تمدّن کے زاویے یہیں سے ابھرتے اور فروغ پاتے ہیں۔ تحریک و ترقی کے سوتے یہیں سے پھوٹتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ روشنی اور اجالے کی شعاعیں یہیں سے اٹھتی اور پھیلتی ہیں۔ اخلاقی قدروں کی بلندی اور پستی کا ظہور یہیں سے ہوتا ہے۔

امرتسر زیارت گاہ بھی ہے اور پنجاب کی تجارتی راجدھانی بھی۔ یہاں کپڑے کرانے لوہے اور چائے کی منڈیاں ہیں اور سٹّے کے بازار۔ دور دور سے سوداگر خرید و فروخت اور سٹّہ بازی کے لئے یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ بنکوں کے ذریعہ سے غیر ملکی تجارت کا فروغ ہے۔ تاجر مرنجاں مرنج، خوش خلق فارغ البال اور تماش بین ہیں۔ زبان شیریں، ملک گیری کے قائل و مؤید تجارتی و مالی مفاد اور حصولِ زر ہی مقصودِ حیات ہے۔ تعلقات کا بناؤ اور بگاڑ ذاتی مفاد کی بنیادوں پر قائم کرتے ہیں۔ شائستہ اور ملنسار ہیں۔ غرض کہ اچھے ہیں پر خدا کام نہ ڈالے۔ پڑ جائے تو آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اور لوہے کی لاٹ بن جاتے ہیں جھگڑوں سے اجتناب کرتے ہیں اور اگر ہو جائے تو زبان درازی سے آگے نہیں بڑھتے۔ "قلم کی لڑائی" کے دھنی ہیں۔ اس میں ہار نہیں مانتے۔ سپریم کورٹ تک مار کرتے ہیں۔ مگر عجیب تر بات ان سے متعلق یہ ہے کہ وہ سٹّے اور جوئے کی یافت سے گئو شالہ کو دان دیتے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی تجارت سے روپیہ کماتے ہیں اور کھادی کے فروغ کے لئے چندہ دیتے ہیں۔ کاروبار میں

چوکس ہوشیار اور باعمل ہونے کے باوجود جوتشی کے مشورے کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ پہروں پوجا پاٹھ میں لگے رہتے ہیں مگر "شغل و تفریح" سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ بہی کھاتے کی ابتداء "شری گنیش آئے نمہ" سے کرتے ہیں اور انکم ٹیکس اور رسوم محترفہ بچانے کے لئے کیا کچھ نہیں کر گذرتے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی دیانت و امانت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔

تجارت میں ہندوؤں کی اجارہ داری ہے اور سوائے چمڑے کے بیوپار کے جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ہر قسم کی سوداگری اور منڈیاں انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ تجارت پیشہ طبقہ کے علاوہ مزدوری پیشہ، حرفت پیشہ بھی آباد ہیں۔ جو کسب حلال اور ان جائز اور معروف پیشوں سے جو انسانی معاشرت کا تقاضا ہیں، اپنی گزر اوقات کر رہے ہیں اور شہر کی عظمت کو بڑھا رہے ہیں گاجی پور اور امرتسر کے درمیان صرف تیس میل پڑتے ہیں۔ آب و ہوا بھی ایک جیسی ہے۔ بولی میں بھی کوئی خاص فرق نہیں اجناس اور پھل پھول کی پیداوار بھی وہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہری چھیل کے کیلے، سیب، انگور، اخروٹ، پستہ اور قسم قسم کے آم جو گاؤں میں دیکھنا نصیب نہیں ہوتے تھے چھبڑے والے گلی گلی لئے پھرتے ہیں۔ یہاں بھنگی اور خاکروب بھی ہیں اور دوسری اقوام بھی جو اپنے پیشوں کی وجہ سے اچھوت سمجھی جاتی ہیں گھروں کی صفائی تو لوگ خود کر لیتے ہیں مگر گلیوں اور سڑکوں کی صفائی، بجلی پانی کا انتظام بلدیہ کے ہاتھ میں ہے جس کے اراکین منتخب ہوتے ہیں اور چند نامزد یہ اراکین اپنے اپنے علاقے کی صفائی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ پولس کے متعدد

تھانے ہیں جو جرائم کی روک تھام کے مدعی ہیں۔ عدالتیں ہیں جہاں انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ خیراتی ہسپتال ہیں جو مفت علاج کرنے کے دعویدار ہیں۔ فائر بریگیڈ ہیں جو آگ بجھانے پر مامور ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول اور کالج ہیں جہاں انہیں امتحانوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے کلب اور سیر گاہیں ہیں جہاں تفریح کے سامان مہیا ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کے میدان ہیں اور کتب خانے ہیں جہاں مطالعہ کے لئے کتابوں اور اخباروں کا انتظام ہے۔ شہر چار دیواری سے گھرا ہوا ہے اس کے بارہ دروازے ہیں۔ شہر کے باہر قلعہ ہے جسے گوبند گڑھ کہتے ہیں۔ ٹھنڈی سڑک ہے جہاں حکام اور امراء کی کوٹھیاں ہیں۔

باپ نے آتے ہی گاڑی اور بیل بیچ دئے۔ دام کھرے کر لئے تین مہینے کی ضروریاتِ زندگی بھر لیں اور مطمئن ہو کر کاروبار کی تلاش کرنے لگا۔ پہرے داری ملتی تھی ماں نے یہ نوکری پسند نہ کی چندروز کی دوڑ دھوپ کے بعد عمارتی کاموں میں مزدوری مل گئی اور آٹھ دس آنے کمانا شروع کر دئے کبھی ناغہ بھی ہو جاتا۔ اور کام بھی پسند کا نہ تھا۔ اور آمدنی بھی کم تھی۔ ٹھیلا خرید لیا اور تجارتی مال ڈھونے لگا۔ پہلے ہی دن ایک روپیہ کما لیا۔ رات کو خوش خوش گھر آیا اور ماں کی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ خوش ہو گئی اور ہم دونوں بھائی بھی اس طرح اچھی گزران ہونے لگی۔

ہم گورنمنٹ اسکول میں داخل ہو چکے تھے۔ میں وظیفہ یاب تھا

لکھنے بھی پڑھائی میں ہوشیار تھا اس لئے داخلے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔
فیس میں بھی مناسب رعایت مل گئی۔ اسکول کی عمارت بڑی شاندار
تھی۔ جماعتوں کے لئے الگ الگ کمرے تھے جن میں طالب علموں کے
بیٹھنے کے لئے ڈیسک موجود تھے اور استادوں کے لئے تخت تھے
جن پر میز اور کرسی لگی ہوئی تھی۔ پڑھائی دسویں جماعت تک تھی۔ ہیڈ ماسٹر
اور دوسرے استاد اگرچہ ہندوستانی تھے مگر انگریزی لباس میں ملبوس
رہتے۔ پنڈت جی اور مولوی جی دیسی زبانیں پڑھاتے تھے لباس بھی دیسی
پہنتے۔ اسکول کے ساتھ ساتھ کھلا میدان بھی تھا۔ جہاں لڑکے کھیلتے کودتے
لکھتے پڑھتے۔ اسکول ایک احاطے سے گھرا ہوا تھا۔ کھانے پینے کے لئے
پھل شربت اور مٹھائی کی دوکان بھی احاطے کے اندر ہی تھی۔ احاطے میں
پھاٹک لگا ہوا تھا۔ جو وقفے کی چھٹی کے وقت بند کر دیتے۔ تاکہ لڑکے
باہر نہ جا سکیں۔ پھر بھی وہ دیوار پھاند کر نکل جاتے۔ جماعتوں میں پڑھانے
کے لئے استاد باری باری آتے۔ اور عام طور پر کھڑے کھڑے ہی اپنے
اپنے مضمون پڑھا دیتے۔ فارسی عربی سنسکرت اور سائنس کے درس
کے لئے ہمیں استادوں کے کمرے میں جانا پڑتا۔ ہمارے اسکول کے لڑکے
امرا، حکام اور اونچے درمیانہ طبقہ سے متعلق تھے کئی ایک کے جزدان نوکر
ہی اٹھا کر لاتے۔ وہ نئی نئی تراش کے کپڑوں میں آتے۔ اکڑفوں اور
شیخی بگھارتے۔ استادوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے۔ حکام کے لڑکے
تھے۔ کہ استاد بھی ان سے دبتے۔ اپنی جماعت میں میں ہی غریب لڑکا

تھا۔ مجھے نشست بھی پیچھے ہی ملی۔ لڑکے، میرے سادہ اور پیوند دار کپڑوں دیہاتی لب و لہجے اور دیہاتی اطوار کو ناپسند کرتے۔ مجھ سے الگ تھلگ رہتے اور رہ رہ کر مجھے میرے افلاس کا احساس دلاتے رہتے۔ ہم اجلے کپڑے پہنتے تھے۔ صابن کپڑوں کو صاف تو کر سکتا ہے مگر افسوس پیوند نہیں چھپا سکتا نہ تراش بدل سکتا ہے۔ افلاس نظموں، خطبوں اور کتابوں میں خدائی رحمت بتایا گیا ہے۔ اور اخلاق اور مذہب اس سے متعلق کیا کچھ نہیں کہتا۔ مگر یقین جانئے چلتی پھرتی زندگی اور اسکول کی چاردیواری میں تو یہ زحمت ہی زحمت ہے!

گاؤں میں ماں کی چاندی کی چوڑیاں ہماری ثروت کا نشان تھیں مگر شہر میں ہمارے افلاس کی علامت بن گئیں۔ لاجونتی نے کہا "بہن! اتار دے یہاں تو بھنگن بھی چاندی نہیں پہنتی، ملمع چڑھوا لے" ماں کو ملمع بازی پسند نہ آئی۔ کانچ کی چوڑیاں پہن لیں مگر حیف! یہ بھی تو آخر افلاس کا نشان ہی تھیں۔

ان مخمصوں کے باوجود گھر میں اچھی کٹتی تھی۔ ہم دونوں بھائی اسکول سے آتے تو ماں سے لپٹ جاتے۔ وہ پیار سے گلے لگا لیتی۔ ہاتھ منہ دھلا کر ناشتہ کراتی بستا کر ہم مطالعہ میں لگ جاتے اور بھول جاتے کہ ہم ایک غریب ٹھیلے والے کے لڑکے ہیں۔ جسے لوگ " او ٹھیلے والے ادھر آنا" کی حقارت آمیز ندا سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور جو لپک کر" ہاں آیا جی" کہتا ان کے پیچھے خراماں خراماں مزدوری کے لئے چل پڑتا ہے۔

تاکہ اپنے بال بچے کا پیٹ پال سکے۔

حضرت مسیح نے مردوں کو جلایا اور اندھوں کو آنکھیں دیں۔ کوڑھیوں کو چنگا کیا۔ لیکن احمقوں پر ان کی مسیحائی نہ چل سکی۔ سچ ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

احمق کی سرشت نہیں بدل سکتی۔ وہ احمق ہی جئے گا احمق ہی مرے گا۔ گاجی پور کے پراشروں نے سمجھا کہ کمینے سر پر آچڑھے ہیں۔ انہیں نیچا دکھانا ضروری ہے۔ عیسائیوں نے سمجھا کہ تبدیلیٔ مذہب سے وہ حاکم بن گئے ہیں۔ پراشروں سے اب دبنے کے نہیں مگر دونوں یہ نہ سمجھ پائے کہ تعزیراتِ ہند کی دفعات کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ عدالت نے فسادیوں کو ملزم گردان کر جیل میں ڈال دیا۔ انجیل کا ارشاد ہے کہ "اپنے دشمنوں سے محبّت کرو۔" عیسائیوں نے اپنے ہمسایوں سے نفرت کرنا شروع کر دیا مہاتما بدھؑ کا فرمان ہے کہ "ہر ذی روح سے پیار کرو" پراشروں نے اشرف المخلوقات کو کشتنی و گردن زدنی قرار دے دیا۔ مکر، فریب، کاہلی تعدّی، ناانصافی ریاکاری قابلِ نفرت چیزیں ہیں مگر ہوا یہ کہ انسان نے انسان سے نفرت کرنا اور ایک دوسرے کو گزند پہنچانا ہی اپنا شعار بنا لیا۔ اگرچہ زندانی کچھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے مگر گاؤں والوں نے گرمی نہ چھوڑی۔ نائن لگاتی بجھاتی رہی۔ اور پراشر اس کی تال پر ناچتے رہے۔ عیسائی بھی نچلے نہ بیٹھے بلکہ آمادۂ شر رہے۔

لمبردار یاترا سے واپس آیا تو گاؤں کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب تھی۔ اسے یہ بھی پتا لگ گیا کہ ہم لوگ زمین بیچ کر امرتسر آ گئے ہیں۔ غازی مالدکیو کی پتّی کا حسینا کے ہاتھ پڑ جانا بھی اسے پسند نہ آیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ جس طرح بن پڑے وہ حالات کو سدھارنے اور ہمیں پھر سے گاؤں میں آباد کرنے کی کوشش کرے گا۔ یوں بھی ہجرت کے بعد لوگ ہماری خامیوں کو بھول چکے تھے۔ ہمارے باپ کے اخلاص اور اس کی دلنواز مسکراہٹ کو یاد کر کے روتے۔ دادی کی خیانت کو موافق رنگ میں پیش کرتے۔ ماں کی "شراب کی کہانی" کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتے۔ اور میرے انعام کا فخریہ ذکر کرتے تھے۔ ہمارا تذکرہ آتا تو حسینا تعریف کے پل باندھ دیتا۔ مولوی صاحب تائید کر دیتے اور دوسرے لوگ اس کی تصدیق ــــــــــــــــــــ

لمبردار اس ادھیڑ بن میں گھر آیا تو لمبردارنی نے کہا "کہتے ڈرتی ہوں! خفا نہ ہو جاؤ کہیں؟"

لمبردار نے بے رخی سے کہا "ہاں کہہ دو کیا کہنا ہے؟ جھجکتی کیوں ہو؟"

لمبردارنی جھینپ سی گئی اور کہا "نہیں خفا ہو جاؤ گے؟"

لمبردار نے کچھ جواب نہ دیا اور کھانا نکالنے کے لئے کہلا بھیجا۔ لمبردار کھانا کھا چکا تو لمبردارنی نے معصومانہ انداز میں کہا "سنا تو نے! دھنپت بیچارہ لُٹ گیا۔ زمین گنوا بیٹھا"

لمبردار "ہاں سن رکھا ہے" کہہ کر دیوان خانے میں چلا گیا۔ اور آرام تکیہ کے سہارے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ لمبردارنی نے پیچھا کیا۔ مگر

دیکھ کر لوٹ آئی۔ لمبردار اٹھا تو لمبردارنی موجود تھی۔ بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میری تو کوئی سنتا نہیں۔ مُوا حسینا! اس نے زمین ہتیالی۔ کہتی تھی خرید لے، خرید لے۔ میری ایک نہ سنی تو نے"

لمبردار نے بے اعتنائی سے کہا "چھوڑ تو اس قصے کو! کوئی اور بات کر"

لمبردارنی نے جھلا کر کہا "واہ! کیا یہ چھوڑنے کی بات ہے؟"

لمبردار نے بیوی کو گھور کر دیکھا اور کہا "کیا اب لے دوں تجھے! بول!"

لمبردارنی نے تمکنت سے کہا "کیونکر لے دوگے؟ وہ مُوا تجھے دینے لگا نفع اٹھائے بغیر!"

لمبردار نے سنجیدگی سے کہا "بھاگوان جھگڑا کیوں بڑھاتی ہو۔ چاہو تو تمہیں انہی داموں میں لے دوں"

لمبردارنی بولی "یونہی دل رکھنے کی باتیں کرتے ہو لے دو تو جانوں"

لمبردار نے ترش روئی سے جواب دیا "چل اپنی راہ لگ۔ یہ سودا تجھے بچنے کا نہیں۔ اس نے لوک (دنیا) کا نہیں پر لوک (آخرت) کا سودا کرلیا۔ روپے لوٹا دئے۔ زمین بھی واپس کردی۔ اور اب مزارع بن کر ہل جوت رہا ہے"

لمبردارنی نے جھلا کر کہا "ہاں لوٹا دئے کیا لگتا ہے اس کا؟ بڑا آیا راجہ کرن کہیں کا۔ دانی، دیالو، سخی، راجہ ہری چند" اور بڑبڑاتی اندر چلی گئی۔ اور یہ سمجھی کہ حسینا نے پٹی پڑھا دی۔ لمبردار سیدھا سادہ آدمی ہے باتوں میں آگیا

لمبردار تذبذب میں تھا۔ مصالحت کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی اور

تفریق و نفاق بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ بڑی پتی والے پرمیشری داس جی اگر سہارا دیں تو شاید راستہ نکل آئے اور گاؤں بربادی سے بچ جائے۔ پرمیشری داس جی معمّر بزرگ تھے۔ لوگ ان کی عزّت کرتے تھے۔ وہ دنیا اور دنیا والوں سے الگ پوجا پاٹ گیان دھیان میں لگے رہتے۔ صرف دو روٹیوں سے کام تھا۔ کام کاج لڑکے ہی کرتے۔ خود نہ دخل دیتے اور نہ دلچسپی لیتے۔ لمبردار نے جرأت کی اور ان کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ آدمی نے کہا "پوجا پر ہیں بعد کو آنا" لمبردار کچھ دیر بعد پھر گیا تو پوتھی (کتاب) پڑھ رہے تھے۔ اطلاع کی تو اندر بلا لیا اور کہا "اچھے ہو پنڈت جی! کیسے آنا ہوا"؟

لمبردار نے حقیقت کھول سنائی اور ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج سہایتا (مدد) کیجئے بھیڑ پڑ گئی ہے۔ حالات کو موافق اور سازگار بنانا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔"

پرمیشری داس جی نے متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تمہاری کہانی دردناک ہے اور تمہارے جذبات قابلِ قدر۔ مگر میں نے تو دنیا چھوڑ رکھی ہے، پربھو (خدا) سے ناتا جوڑ لیا ہے۔ اب اور کاموں کی فرصت کہاں! تم خود ہی نمٹ لو" یہ کہہ کر انہوں نے بآوازِ بلند پوتھی پڑھنا شروع کر دی منشاء یہ تھا کہ بہت ہو لی اب سدھارو!

مگر لمبردار ڈٹا رہا اور رقّت انگیز الفاظ میں کہا "تو پھر گرتوں کو کون سہارا دے گا؟ بگڑی کیونکر بنے گی۔؟ غازی مالدیو کا نام کون لے گا' سادھو ٹک بیٹھے پر ستیں کون جگ کو پار اتارا' اگر خدا رسیدہ لوگ پہاڑوں میں چھپ بیٹھیں

تو پھر دنیا کا نجات دہندہ کون بنے گا۔"

پرمیشری داس جی نے کہا "اگر پربھو اچھیا (تقدیر الٰہی) یہی ہے تو کون مٹا سکتا ہے۔ اور پوتھی پڑھتے پڑھتے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ لمبردار نے ٹھنڈی آہ بھری اور چلنے ہی کو تھا کہ اندر سے پوتھی کا یہ واک (قول) سنائی دیا "بھیے نہ کوئی سادھ بنا تے سادھ نے دکھے جگ وچ کوا" برگزیدہ لوگ ہی بگڑی بنا سکتے ہیں مگر وہ ہیں کہاں؟ لمبردار نے اسے اتفاق سمجھا اور دل میں کہا " یہ کام کسی کمزور انسان ہی کو کرنا ہو گا۔ چلو! کوئی اور نہیں تو میں ہی سہی"

حکیم دیو جانس انسانی ہڈیوں کو بغور دیکھ رہا تھا کہ سکندر نے پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے بے رخی سے جواب دیا "یہی کہ تیرے باپ اور اس کے غلام کی ہڈیوں میں کیا فرق ہو سکتا ہے!"

ممکن ہے کہ انسانی ہڈیوں میں یکسانی ہو مگر آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔! یہ کہاوت نادرست نہیں۔ سبب چاہے نسب ہو یا ماحول، تعلیم ہو یا تربیت، طبیعت کی افتاد ہو یا حالات کی مجبوری، مفاد ہو یا اعتقاد، لوگ لاشعوری طور پر اپنی اپنی منزل کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ میرے ماں باپ نے فرار میں سلامتی دیکھی وہ امرتسر بھاگ آئے۔ پرمیشری داس جی نے ترک میں تسکینِ قلب پائی۔ وہ دنیا سے علیٰحدہ ہو بیٹھے۔ نائن نے شر و فساد کو اچھا جانا لگانے بجھانے کو مقصودِ حیات بنا لیا۔ لمبردارنی نے ذاتی مفاد کو مقدم سمجھا، ہماری زمین کو ہڑپ کرنے کے منصوبے بنانے لگی۔ زندانی بدحالی

کے باوجود انتقام میں اندھے ہو رہے تھے۔ انہوں نے نت نئے منصوبے بنانا اپنا
شعار بنا لیا اور لمبردار تھا کہ کام کاج چھوڑ کر تنِ تنہا بھلائی کی طرف لگ گیا۔

دانا اور نادان میں یکسانی صرف یہ ہُوا کرتی ہے کہ دونوں پیدا ہوتے
ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ورنہ نور اور ظلمت میں ساجھا کہاں؟ زندگی میں ان کی راہیں
یکسر الگ الگ ہی رہتی ہیں۔ زندگی کی نعمتیں بھی دو مختلف حصوں میں بٹی ہوئی
ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہیں مذہب دنیاوی کا نام دیتا ہے۔ یعنی عیش و عشرت،
دولت و حشمت وغیرہ۔ امتیازی صورت ان کی یہ ہے کہ ان کے حصول میں اگر
ایک کو فائدہ پہنچتا ہے تو دوسرے کو نقصان۔ تصرّف ان کا چند اشخاص تک
محدود ہے۔ ان میں استقامت نہیں۔ ہر تی پھرتی چھاؤں ہے۔ جلد ضائع ہو جاتی
ہیں چھینی بھی جا سکتی ہیں۔ بلکہ آپ سے آپ ایک کے قبضے سے نکل کر دوسرے
کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جنہیں آپ "روحانی" کا نام دے سکتے ہیں
نیکی و رواداری وغیرہ۔ خصوصیت ان کی یہ ہے کہ ان کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں
خرچ کرنے سے ختم نہیں ہوتیں۔ بلکہ اور بڑھتی ہیں۔ مل جائیں تو جزوِ حیات بن
جاتی ہیں۔ اور انہیں کوئی چھین نہیں سکتا۔ زندگی کی اس راہ اور نعمتوں کی اس
بانٹ میں لمبردار ایک طرف تھا اور سارا گاؤں دوسری طرف۔ حتیٰ کہ اس کی
منکوحہ اور اس کا لاڈلا اکلوتا بیٹا بھی اس کے ساتھ نہ تھے۔

لمبردار گھر آتا تو لمبردارنی اور رمیش حسینا کو گھیرے ہوئے تھے وہ بیچارہ
ہاتھ جوڑے خاموش کھڑا تھا اور یہ اسے دھمکا رہے تھے۔ رمیش تو دیکھتے ہی
کھسک گیا۔ مگر لمبردارنی حسینا کو "مُوا کہیں کا جا دفع ہو" کہہ کر تن کر کھڑی رہی

لمبردار نے پوچھا" آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا تماشا ہے جو تم ماں بیٹا کر رہے ہو؟"
لمبردارنی نے گرج کر کہا "یہی تو ہے مری پڑے، مُوا دہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ میں کیونکر مانتی، سیدھے ہاتھ نہ دے گا مُوا" اور لمبردار کی طرف منہ پھیر کر چیں بجبیں ہو کر کہا" ناک چنے نہ چبوا دوں تو میرا نام"! لمبردار نے سرد آہ بھر کر کہا" نام تو تو نے آج کر لیا۔ شاباش! پر ناک چنے کسے چبوائے گی تو، اسے یا مجھے؟ یہ تو بتا دے" لمبردارنی نے سُنی اَن سنی کر دی اور خاموش کھڑی رہی۔

مخالفت گھر میں ہو تو باہر والوں سے موافقت کی کیا امید؟ مگر لمبردار نے ہمت نہ ہاری۔ مولوی صاحب کے مشورہ سے گاؤں والوں کو اکٹھا کر لیا اور سمجھوتے کی بات چیت شروع کر دی۔ پراشر چارپائیوں پر بیٹھ گئے، جو پہلے ہی سے بچھا رکھی تھیں۔ جہاشے اور رمداسئے زمین پر ٹک گئے۔ عیسائی چارپائیاں ساتھ لے آئے اور بچھا کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے چند ایک پیپل پر چڑھ بیٹھے۔ پراشروں نے اعتراض کیا کہ رواج و دستور کے مطابق عیسائی ہمارے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ عیسائیوں نے کہا" میگھ اور رمداسئے تمہارے خیال میں نچلے درجے کے ہندو ہیں۔ انہیں زمین پر بٹھاؤ یا پاتال (تحت الثریٰ) میں۔ ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہم عیسائی ہیں تمہارے ذلیل نہیں۔ ہم نیچے نہیں بیٹھیں گے۔ بلکہ دیکھو ہم لوگوں میں سے چند ایک پہلے ہی پیپل پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم سے اونچے! اور چونکہ عیسائی ہیں اونچے بیٹھنے کے حقدار بھی ہیں" یہ سن کر پراشروں کے حلقے میں غم و غصے کی

لہر دوڑ گئی۔ سب نے یکزباں ہو کر کہا "یہ ناقابلِ برداشت ہے کہ مزارعے مالکوں کی برابری کریں۔ اور ان کے منہ آنے کی کوشش کریں" مولوی صاحب نے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اور لمبردار نے عاجزی اور نرمی سے کہا جھگڑا نمٹانے کے لئے اکٹھے ہوئے ہو یا بڑھانے کے لئے؟ قیدیوں کی طرف دیکھو ان کے بلکتے اور بلبلاتے بیوی بچوں کا خیال کرو۔ وہ بیچارے جیل میں سڑ رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اُن کی رہائی کی تدبیر سوچو" اتنے میں شور مچ گیا "تھوک دیا تھوک! تھوک! نیچے اتارو ان کمینوں کو۔ ان رذیلوں کو" شور سن کر پولس آ گئی۔ لوگ منتشر ہو گئے اور لمبردار ہکّا بکّا رہ گیا۔

مولوی صاحب نے کہا "دیکھ لیا تم نے پنڈت جی! بُرے دن ہوں تو مت ماری جاتی ہے۔ ان کی عقل ٹھکانے نہیں رہی، پھر سہی، دل برداشتہ ہونے کی بات نہیں۔ "ہارئیے نہ ہمت بسارئیے نہ رام (خدا)" مضبوط رہیئے خدا نے چاہا تو حالات آپ سے آپ سازگار ہو جائیں گے ورنہ مشیّتِ ایزدی جو وہ چاہے!"

لمبردار نے کہا "مولوی جی! ایسا ہی ہو گا۔ جب تک جان میں جان ہے میرے قدم پیچھے نہ ہٹیں گے۔ پرماتما توفیق دے"

چھوٹے بڑے واقعات حوادث اور عقدوں کی الجھنوں سے زندگی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نتائج سے بچنا بھی ممکن نہیں۔ ہم فانی انسانوں میں سے ہر ایک کے لئے ان سے عہدہ برآ ہونا، ان کا غلط یا صحیح حل ڈھونڈ

نکالنا اور پھر اس کے نیک و بد نتائج سے دوچار ہونا لازم ہو جاتا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے جس کی گرفت سے بچنا محال ہے۔

ماں کی ممتا تھی جس کی تنویر سے ہمارے در و بام جگمگا رہے تھے۔ باپ کی شفقت تھی کہ رحمت بن کر نور برسا رہی تھی۔ بھائی کا پیار تھا کہ خوشی کا ختم نہ ہونے والا خزانہ تھا۔ شہر کی نوعیت تھی کہ ہمارے لئے نئی نئی مسرتوں کا گنجینہ بنی ہوئی تھی۔ دلوں میں محبت تھی، سینوں میں الفت۔ عمل میں لذت۔ نزاع کی بات گھر میں کوئی نہ تھی۔ امن و عافیت کا عمل دخل تھا۔ والدین ہمارے محافظ تھے اور ہم ان کے فرمانبردار۔ پھر بھی دلوں میں ایک چبھن تھی جو ہم میں سے ہر ایک کو رہ رہ کر بے چین کر دیتی!

دیہاتی ماحول باپ کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکا تھا۔ وہ منہ اندھیرے اٹھتا۔ ٹھیلا صاف کرتا اور نہر کی سمت (جس میں بقول اس کے "اس کے راوی کا پانی" بہتا تھا۔) چل پڑتا۔ راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں سے گزرتا۔ کسانوں اور مزارعوں سے دلجوئی اور دلدہی کی باتیں کرتا۔ نہر میں نہانے اور اس کا چلو بھر پانی پینے کے بعد گھر لوٹ آتا۔ کھانا کھاتا اور ٹھیلا لے کر چوک میں کھڑا ہو جاتا۔ اس دوران میں اسے بار بار اپنی زمینداری کا خیال آتا۔ کھیتوں کی مٹی سے اسے موسمی اجناس، پھلوں اور پھولوں کی بو باس آتی۔ اٹھتی فصلوں کے تصور میں اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا کہ اچانک "او ٹھیلے والے! چلے گا کیا؟" کی صدا اسے چونکا دیتی۔ اور وہ سب کچھ بھول کر مال ڈھونے کے لئے چل پڑتا۔ تانگے والوں سے تصادم، ٹھیلے والوں سے

چشمک، راہ گیروں سے تکرار، گاہکوں سے رد و کد روز کا معمول تھا۔ وہ ان سے بچ بچا کر وقت کاٹ لیتا۔ کوئی گالی بکتا تو "بھائی زبان کیوں گندی کرتے ہو" کہہ کر چپ ہو جاتا۔ مگر پڑوس میں گراموفون پر جب یہ شعر

الٰہی کوئے جاناں میں جو کوئی دیس گاتا ہے
تو پھر ہم بے کسوں کو دیس اپنا یاد آتا ہے

اس کے کان میں پڑتا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ عجیب کیفیت اس پر طاری ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور نغمے کی لے شعلہ بن کر اس کے قلب و جگر میں آگ لگا دیتی اور وہ حسرت زدہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں کی طرف تکنے لگتا۔ اور ہمارے گھر میں اداسی چھا جاتی

ماں کو باہر کی دنیا سے لگاؤ تھا نہ دلچسپی۔ شہر میں کوئی رشتہ دار نہ تھا کہ اس کے ہاں آنا جانا ہوتا۔ لے دے کے لاجونتی تھی کہ اس کے ساتھ تیج تہوار مندر گوردوارہ ہو آتی۔ ورنہ وہ تھی اور گھر کی چاردیواری۔ کام دھندے میں لگی رہتی۔ وہ گاجی پور کو بھول چکی تھی۔ اکثر کہتی "گاؤں کی ٹھنڈی ہوا اور میٹھے پانی کو کیا کروں؟ جہاں تم وہیں میری دنیا۔" اگرچہ وہ ہمارے لئے رحمت و برکت کا سرچشمہ تھی۔ باپ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ اور ہم دونوں بھائی اس پر جانیں نثار کرتے تھے۔ مگر وہ بھی الجھن میں رہتی۔ ایشر داس ہمارے ماموں کا رشتہ دار کپڑے کی کسی دوکان میں منیم تھا۔ سفید پوش کم گو آدمی تھا۔ دن چڑھے کام پر چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اچھی گزر تھی۔ جمانی پروہتی بھی چلتی تھی۔ اس کی بیوی تیز مزاج اور بانونی عورت تھی۔ کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ ایک لڑکی تھی

رانی آ جو لائل پور میں ایک آڑھتئے سے بیاہی ہوئی تھی۔ گھر میں اکثر جھگڑا رہتا۔ اگرچہ ہم دخل نہ دیتے اور الگ تھلگ بھی رہتے مگر کبھی کبھی سننی سنانی پڑتی اور ہمارے گھر میں بدمزگی پیدا ہو جاتی۔ اچھے مزاج میں ہوتی تو اپنی دولت کا ذکر، زیورات کی تفصیل، اپنی بیٹی کی خوشحالی، اس کی اولاد اور اس کی فارغ البالی کا تذکرہ لے بیٹھتی۔ بات کو طول دینے اور ماں کو متاثر کرنے کے لئے بات کو بار بار دہراتی۔ ماں کو بادلِ ناخواستہ سننا پڑتا۔ اور ہاں میں ہاں ملانی پڑتی۔ کبھی کبھی ماں سے بھی الجھ پڑتی اور وہ دکھی ہو جاتی۔ ماں کو باپ کے خلاف اکسانا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ جب ماں کی بے رخی اور بے توجہی دیکھ کر مایوس ہو جاتی تو یہ کہہ کر "تو بیوی کاہے کی ہے، تو تو مٹی کا بے جان پتلا ہے، بنی رہ میرا کیا بگڑتا ہے" اپنا جی ٹھنڈا کر لیتی اور ماں کو آزردہ کر دیتی۔

اسکول کا ماحول ہمارے موافق نہ تھا۔ حلوائی سے کچھ لینا ہوتا تو چلّانے کے باوجود وہ توجہ نہ کرتا اور ہماری باری مشکل سے آتی۔ اگرچہ ہمارے پیسے ٹکسالی ہوتے، چیز ہمیں ناقص ہی ملتی اور ہمارے احتجاج کو کوئی خاطر میں نہ لاتا۔ چپڑاسی بھی پروا نہ کرتے اور بابو بھی ہماری نہ سنتے۔ جہاں بھی جاتے افلاس سائے کی طرح ہمارے پیچھے پیچھے رہتا۔ باز کی قدر و منزلت اسکی بلندیِ پرواز کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے گلے کے گھنگروؤں کی جھنکار کی بدولت۔ مگر حد حیف! انسان سے متعلق معاملہ بالکل برعکس ہے۔ خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ دولت کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

ہمارے اسکول کے قریب ہی ایک لڑکا کھیلتا کھیلتا ٹھیلے تلے آکر زخمی

ہوگیا۔ ٹھیلے والے کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اور مضروب کو ہسپتال بھیج
دیا۔ یہ خبر ٹھیلے والوں میں آناً فاناً پھیل گئی۔ باپ نے سنا تو گھبرا گیا اور ٹھیلا
ایک ساتھی کو سونپ کر اسکول کی طرف بھاگا۔ اور میری تلاش میں برآمدے میں
پھرنے لگا۔ اتفاقاً نگاہ پڑگئی تو میں اجازت لے کر باہر آگیا۔ باپ نے جوشِ
مسرت سے گلے لگا لیا اور تکلیف سے متعلق پوچھ کر مطمئن واپس چلا گیا۔ میں
جماعت میں واپس آیا تو ماسٹر جی نے پوچھا "یہ کون تھا؟" میں نے جواب دیا
"جناب! میرا باپ"۔ وہ مسکرا دئے اور لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے اور شرارت آمیز
نگاہوں سے میری طرف تکنے لگے۔ میری حالت قابلِ رحم تھی کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"
میں خفیف ہو کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور میرا دل اتنا اچاٹ ہوا کہ میں سوالوں کے حل کی طرف
دھیان نہ دے سکا۔ خاموش اور ملول بیٹھا رہا۔ گھنٹی کے بعد لڑکوں نے مجھے اتنا
ستایا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں ڈرتا جھجکتا شکایت لے کر گیا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی
لاچار تکلیف کو لے کر گھر آگیا۔ اور ماں کی گود میں سر ڈال کر رونے لگا۔ میرے باپ کا
پہناوا وہی تھا جو عام طور پر ٹھیلے والوں کا ہوا کرتا ہے۔ سر پر ٹپکا۔ تن پر گاڑھے کا
شلوکا۔ نیچے ملگجا تہ بند۔ پاؤں ننگے۔ اگرچہ لباس نہ کسی کو نیک بنا سکتا ہے نہ بد،
نہ عالم نہ جاہل، مگر لباس ہی تھا جو میری تحقیر و تذلیل کا باعث بن گیا۔ لڑکے
سمجھ نہ پائے کہ اتنے گھٹیا کپڑوں والا بھی کسی کا باپ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے
مجھے اپنے معیارِ زندگی سے جانچا اور میں نشانۂ تضحیک بن کر رہ گیا۔ ماں کے
لئے میرا اور تکلیف کا اس حال میں قبل از وقت آجانا ایک نئی بات تھی۔ وہ
حیران و ششدر رہ گئی اور دلاسا دے کر پوچھا "کیوں؟ کیا ہوا؟ بتا تو سہی"

میں نے سسکیاں بھرتے بھرتے سارا حال کہہ سنایا۔ اس نے سنتے ہی کہا "گدھے کہیں کے! بڑے بدتمیز لڑکے ہیں وہ! میں تمہیں ان کے ساتھ پڑھنے نہ دونگی اپنے باپ کو آ لینے دو، تمہیں کسی دوسرے اسکول میں بٹھا دوں گی۔! ماں باپ رنگت اور جنم بھوم کس کے بس کی بات ہے؟ پرماتما کا کارخانہ ہے جس طرح بنا دیا بن گیا۔ اس میں کسی کا کیا دوش (قصور)؟ پھر تمہارا باپ تو عالی نسب ہے، غازی مالدیو کے پڑپوتے کا بیٹا، جس نے بہادری دکھا کر اور جان دے کر خطاب اور جاگیر حاصل کی۔ یہ کمینے کیا جانیں؟ تمہیں بتاؤ یہ دولت انہوں نے کونسا تیر مار کر اور بہادری دکھا کر حاصل کی۔ آخر یہ تجارتی ہیر پھیر مکر چکر ہی کا کرشمہ ہے وہ تمہارے باپ کے جوتے کی بھی ریس نہیں کر سکتے۔ لہو پسینہ کر کے کماتا ہے۔ لکھائی پڑھائی میں تمہارا مقابلہ کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ دیکھ لینا! وقت کی بات ہے دولت بھی تمہاری لونڈی ہوگی۔"

ماں کے ان شفقت آمیز الفاظ نے ہمارے رِستے زخموں پر پھاہے کا کام دیا۔ غازی مالدیو کا ذکر، اسکول کی تبدیلی، ان بے رحم بے لگام لڑکوں سے چھٹکارا، باپ کے جوتوں کی فضیلت (جو بیچارے کو ابھی نصیب بھی نہ ہوئے تھے) میری تسکین کا باعث بن گئے۔ اور میں اپنے کو ان لڑکوں سے ارفع و اعلےٰ سمجھنے لگا۔ میں ماں کے گلے لگ گیا۔ لکھی سہم گیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی اور میں نے اس کا منہ چوم لیا۔

باپ آیا۔ کھانا کھا چکا تو ماں نے ہنستے ہنستے کہا "بیٹے سے ملنے اسکول گئے تھے کیا؟" باپ نے کہا "ڈر گیا تھا چوٹ نہ آ گئی ہو ان میں سے کسی کو!

بھاگا بھاگا گیا، صحیح وسلامت دیکھ کر جان میں جان آئی۔"

ماں نے کہا " اچھا کیا جو دیکھ آئے! کہتے ہیں نکو، بنچ پر بیٹھتا ہے وہاں؟"

" ہاں سبھی لڑکے بنچ ہی پر بیٹھتے" باپ نے کہا

" مگر لڑکے چھیڑتے تھے اور نقل اتارتے تھے۔ کہ تیرے باپ کی مونچھیں شبیر کی سی ہیں" یہ کہتے کہتے اس نے قہقہہ لگایا "تنگ آکر دونوں گھر آبیٹھے وہ لڑکے نادان تو ہوتے ہی، کیا جانتے کہ آخر شبیر ہی تو ہو غازی مالدیو کی اولاد!"

باپ نے کہا "تیرے آگے تو بھیگی بلی ہوں۔ دم نہیں مار سکتا"..

ماں نے بات کاٹ کر کہا" ہاں کتنا ڈرتی تھی۔ بھول گئے کیا؟"

باپ ہنس دیا اور کہا "کب کی کہو، اب کی یا جب کی...؟"

ماں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا " انہیں کسی دوسرے اسکول میں بٹھا دو، لڑکے شیطان کا لشکر ہوتے ہیں ان کی چھیڑ بن گئی ہے انہیں تنگ کرتے رہیں گے پڑھائی میں حرج ہوگا۔ مضایقہ نہیں زیادہ فیس بھر دیں گے۔"

دوسرے دن ہم نے ناغہ کر لیا۔ باپ سرٹیفکیٹ لے آیا وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ لڑکا وظیفہ یاب ہے استاد لیت ولعل کریں گے مگر کسی نے پروانہ کی۔ اس پر روشن ہوگیا کہ امتیازی حیثیت کے باوجود اس کے لڑکوں کی قدر ومنزلت محض اس لئے نہیں کہ وہ غریب زادے ہیں اور اس تذلیل کا باعث صرف "مفلسی ہے، مفلسی ہے، مفلسی"

اب ہم دوسرے اسکول میں داخل ہوگئے تھے جہاں ہماری حیثیت کے

لڑکے بھی تھے ۔ استاد مہربان تھے اور ہم سبق ہمدرد ۔ ہم خوش وخرّم رہنے ۔ دن اچھے کٹنے لگے ۔ ہم نے پہلے اسکول کی یاد دل سے بھلا دی ۔ ادھر کا آنا جانا بھی بند کر دیا ۔ مگر ان لڑکوں نے ہمیں نہ بھلایا ۔ ملتے تو آوازے کستے اور ہمیں ملول و مایوس بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے ۔ !

دولت رام نے آپ بیتی جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے پیارے! یہاں جو گوجر دکھائی دیتے ہیں، ہندوستان کے قدیم یا اصلی باشندے نہیں ہیں۔ یہ وسط ایشیا کے وحشی اور خونخوار قبیلہ "ہون" کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے آتے ہی انہوں نے راجپوتانہ پر اپنا تسلط جما لیا اور سلطنت قائم کرلی جس کا دارالحکومت بھمل یا سریمل تھا۔ جو کوہِ آبو سے پچاس میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ آہستہ آہستہ ان کا اقتدار بڑھتا گیا۔ اور "کہاں راجہ بھوج[۱] اور کہاں کنگلا تیلی" والے راجہ بھوج کے عہدِ حکومت میں (۸۴۰ تا ۸۹۰ ء) ان کا راج دریائے چناب سے دریائے نربدا تک پھیل چکا تھا۔ اسی دوران میں کاٹھیاوار کا صوبہ (جس میں گجرات اور مالوہ کا علاقہ بھی شامل ہے) انکے زیرِ نگیں

---

[۱] اصلی نام مہی راہ تھا بعد کو "بھوج" کے لقب سے ملقب ہوا۔

آگیا تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں (۱۰۱۹ء) تک ان کے اقتدار میں کوئی کمی نہ آئی۔ بعد کو ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اور پھر کھوج ہی مٹ گیا سے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا   مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

اپنے پیشرو ساکا، کشان، یوچی ہن کی طرح وہ بھی ہندوؤں میں جذب ہو گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ راجہ بھوج نے اپنے کو وشنو[1] کا اوتار کہنا اور اس کی تصدیق و تائید میں "آدی باراہ" کہلانا شروع کر دیا تھا۔ کوٹلی گوجراں کے گوجر اسی قوم کے "باری ہر" (جس کو پراتی ہر بھی کہتے ہیں) گوت سے متعلق ہیں۔ جو گجرات (پنجاب) اور گوجرانوالہ کے علاقوں سے نقلِ مکان کر کے اس زرخیز علاقے میں آباد ہو گئے اور نواح کے پٹھانوں کے زیرِ اثر مسلمان ہو گئے

کوٹلی کی حدود ہمارے گاؤں سے ملتی تھیں اس لئے آپس کا آنا جانا رہتا حسینا گوجر اسی گاؤں کا قدیمی باشندہ تھا۔ وہ ان پڑھ تھا مگر جفاکش اور محنتی۔ زمین اس کی دس بارہ ایکڑ سے زیادہ نہ ہو گی۔ مگر اس کی حالت ہم لوگوں سے بدرجہا بہتر تھی۔ وہ کفایت شعار تھا۔ اجناس کے ساتھ ساتھ سبزی ترکاری پھل پھول بو کر اپنی آمدنی بڑھا لیتا۔ عورتیں بھی بیکار نہ رہتیں۔ ساتھ کے گاؤں قصبوں میں سبزی ترکاری دے کر مبادلے میں اجناس لے آتیں۔ اور اس سے مزید فائدہ ہو جاتا۔

لمبردارنی کے چنگل سے بچ نکلنا حسینا نے غنیمت جانا اور ڈگ بھرتا اپنے گاؤں کی طرف چلا۔ مولوی صاحب بھی مدرسے سے فارغ ہو کر گھر کو جا رہے تھے

---

[1] وشنو کے تین اوتار بتلائے گئے ہیں مچھ (آبی) کچھ (آبی و خشکی) باراہ (خشکی) چوپایہ ارتقا کے مدارج

انھوں نے حسینا کا راستہ روک لیا۔ اور کہا "میاں ذرا بتانا جو سنتا ہوں، فسانہ ہے یا حقیقت؟"

حسینا چونکا کہ لمبردارنی کا قضیہ مولوی صاحب کو اتنی جلدی کیونکر معلوم ہوگیا۔ ٹال گیا اور کہا "مولوی جی! بات سمجھ نہیں پایا، جلدی میں ہوں گھر پہنچنا ہے"

مولوی صاحب نے روک کر کہا "خیر مضائقہ نہیں، تجھ سے پوچھنا ہے کہ دھنپت سے خرید کر زمین کو پھر اسی کے حق میں ہدیہ کر دینا تجھ سے کیونکر بن آیا میں سمجھ نہ سکا"

حسینا نے مولوی صاحب کی طرف غور سے دیکھا اور کہا "مولوی صاحب! اکیلے تم ہی نہیں، لمبردارنی بھی یہ سمجھ نہیں پائی۔ آج ہی جھگڑا کرتی تھی۔ مگر مولوی صاحب! یہ سمجھنے سمجھانے کی بات نہیں۔ سیدھا سا نکتہ ہے" پیار، دینا جانتا ہے لینا نہیں جانتا" دھنپت میرا یار ہے۔ یاری میں عیاری کیسی!"

مولوی صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا "کہتے کیوں نہیں کہ تم نے اس کے کہے پر پھول چڑھا دئے۔ اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں آگئے"

حسینا نے تمکنت سے جواب دیا "کون کہتا ہے یہ، وہ تو اب بھی نہیں مانتا، کاغذ واپس کر دیا ہے۔"

تو پھر تم کیوں ضد کرتے ہو؟" مولوی صاحب نے پوچھا "چلو چھوڑو، اس میں اب کیا دھرا ہے"

حسینا نے کہا "واہ مولوی صاحب! تم نے بھی خوب کہی۔ بات بدلی، ساکھ بدلی۔ تھوک کر چاٹ لوں کیا؟"

مولوی صاحب نے کہا "میں کب کہوں کہ جاٹو، وہ لیتا نہیں۔ زمین تو آپ سے آپ تیرے پاس ہی رہ گئی۔ بغیر تردد کے، فکر کاہے کا رہا۔"

حسینا نے جھلا کر کہا "مولوی صاحب! ان پڑھ آدمی ہوں، اجڈ گنوار، ٹیڑھی ترچھی نہیں جانتا۔ فکر تو یہ رہا کہ وہ لیتا نہیں، اگر نہ لے تو میری بات نہیں رہتی"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"کیا کروں گا؟ یہی کہ ہدیہ واپس نہ لوں گا۔ پردیس گیا ہوا ہے۔ مزدوری کرتا ہے۔ پیٹ بھی بھرتا ہے یا نہیں کیا معلوم؟" حسینا نے بھرائی ہوئی آواز میں مزید کہا "خدا کی قسم نہیں لوں گا، نہیں لوں گا۔" یہ کہتا کہتا وہ ہوا ہو گیا۔

مولوی صاحب نے دیکھا کہ اس کا چہرہ نورانی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نور برسا رہی تھیں۔ وہ سر تا پا نور بن گیا تھا۔ اور فرشتے اس پر چھاؤں کر رہے تھے۔ مولوی صاحب گھوڑی سے نیچے اترے۔ احتیاط سے اس کے پاؤں کا نشان ڈھونڈا اور نقشِ کفِ پا کی مٹی اٹھا کر اپنے جیبی رومال میں باندھ لی۔

لمبردار نے بیوی اور بیٹے کو برملا تو کچھ نہ کہا مگر ان سے کھچا کھچا رہنے لگا۔ بیشتر وقت دیوان خانے ہی میں گزارتا۔ اور کھانا بھی وہیں منگوا لیتا۔ لمبردارنی نے کئی بار سکوت توڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ متواتر اپنا سا منہ لے کر واپس آنا پڑتا۔ ناچار ایک رات پیٹ درد کا بہانہ تراش کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لمبردار کو تیمارداری کے لئے اٹھنا پڑا اور بول چال شروع ہو گئی۔

لمبردارنی کئی دن یونہی چارپائی سے چمٹی رہی۔ اس دوران میں اس نے زمین سے متعلق کوئی بات نہ چلائی۔ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ باپ نے ہدیے کا کاغذ واپس کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ میں اس غازی کے خاندان سے ہوں جس نے تیغ مار کر جاگیر حاصل کی تھی۔ "بات جو جاہے اپنی ؛ پانی مانگ نہ پی" کا پابند ہوں۔ ایسا گیا گزرا لفنگا ہوں کہ بھک منگوں کی طرح گوجر کا صدقہ جھولی میں ڈال لوں۔ یہ سن کر لمبردارنی کا حوصلہ بندھ گیا۔ وہ حسینا کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ حسینا نے گاؤں میں آنا جانا بند کر رکھا تھا۔ جھگڑے سے بچ بچ کر وہ دور ہی دور رہتا۔ لمبردارنی نے رمیش سے کہا "حسینا ملے تو اسے بلا لانا" حسینا نے آنے سے انکار کر دیا اور کہا "مجھے عورتوں سے کیا کام ؟ اگر کچھ کہنا ہے تو لمبردار خود کہے" رمیش نے آکر ماں سے کہہ دیا کہ حسینا کا رویہ گستاخانہ ہے۔ اس نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتا ہے "کہنا ہے تو لمبردار خود آکر کہے"۔ نائن پاس کھڑی تھی۔ ناک منہ چڑھا کر بولی "لاتوں کا بھوت باتوں سے کب مانتا ہے، کمینہ کہیں کا، جوتیاں کھائے بغیر سیدھا نہ ہوگا۔ چوہدری، سردار، سفید پوش، تھانیدار کہیں کا۔ رانی خاں کا سالا ہے جو لمبردار اس کے پاس چل کر آئے؟ ....."

لمبردارنی نے بات کاٹ کر کہا "اپنی اوقات تو پہچانے۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ جورو چھیبڑا اٹھائے دن بھر "ترکاری لے لو۔ بھاجی لے لو" چلاتی پھرتی ہے اور آپ رسالدار بنا بیٹھا ہے۔ لمبردار نے بیکار سر پر چڑھا رکھا ہے"

نائن نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا " ہائے کیا کروں، راجہ یہاں ہوتا تو پل بھر میں سیدھا بنوا دیتا، آنکھوں ڈالے نہ چبھتا۔ خیر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ لچھمن گنڈا میں سے کسی کو ساتھ لے جانا۔ ہموار ہو جائے گا۔ ان کے سامنے ہیکڑی نہ چلے گی۔ انہیں بات منوانے کا ڈھنگ آتا ہے"

رہتش نے کہا " بات اور بگڑ جائے گی، جھگڑا بڑھ جائے گا۔ پنڈت جی اور خفا ہو جائیں گے۔ آگے ہی سیدھے منہ بات نہیں کرتے"

نائن بولی " نہیں بیٹا! تجھے کیا پتا۔ جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوگی۔ جیتا دم نہ مار سکے گا۔ ہل نہ سکے گا۔ بولے گا تو کرموں کو روئے گا۔ تم انہیں کیا سمجھو؟ میں انہیں جانتی ہوں۔ ہاں دیکھنا! نشے پانی کے لئے پانچ روپے لیتے جانا۔ بھولنا نہیں"

لمبردارنی نے فوراً پانچ روپے دے دئے اور تاکیداً کہا " دیکھنا بچ کر رہنا، وہ جانیں اور جیتا"

لچھمن اور گنڈا علاقے کے نامی بدمعاش تھے۔ لمبردار ان کا گاؤں میں سے گزرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اور انہیں نزدیک تک نہ آنے دیتا تھا۔ مگر صاحبزادۂ بلند اقبال تھے کہ ان کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ کہیں مہم پر گئے ہوئے تھے اس لئے مل نہ سکے۔

لمبردار کو پتا لگ چکا تھا کہ باپ نے ہدیہ واپس کر دیا ہے۔ اسے حالات کے سازگار ہونے کی امید بندھ گئی باپ کے گاؤں میں پھر سے آباد ہونے کے امکانات روشن ہو گئے لمبردار نے مولوی صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا

"دھنپت کا گاؤں میں آنا مقدم ہے۔ اس کے بعد ہی بات آگے بڑھ سکے گی۔"
یہ کہتے کہتے میرے باپ کی چٹھی، جو اس نے حسینا کو بھیجی تھی جیب سے نکالی اور پڑھنا شروع کر دی۔ مضمون یہ تھا:-

"میرے پیارے بھائی میاں حسینا جی! تمہاری بھاوج کی طرف سے تمہیں سلام پہنچے۔ نکو لکھمی کی طرف سے ہاتھ جوڑ کر پرنام (آداب) وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ میری طرف سے بہت بہت بندگی۔ ہم یہاں بہت سکھی ہیں۔ دکھ ہے تو صرف یہ کہ تم سے دور ہو گئے ہیں۔ تم نے ہمارے بگڑے ہوئے کام سنوار دیئے اور ہمارا گھر بربادی سے بچا لیا۔ ہم تمہارا احسان نہیں بھلا سکتے ہمارا روزگار اچھا ہو گیا ہے۔ روٹی پر روٹی رکھ کر کھاتے ہیں ہم نے تمہارا ہدیہ رکھ لیا تھا۔ نہ جانے کب کام آ جائے۔ تمہارے قدموں کی بدولت ہمارے کام آپ سے آپ بن سنور رہے ہیں اور ہمارے قدم جم گئے ہیں۔ بارش ہو جائے تو پھر رہٹ کون چلائے؟ دھوپ بارش نہ ہو تو چھاتے کی کیا ضرورت؟ تندرستی ہو تو پھر حکیم سے کیا کام؟ تمہارا ہدیہ واپس کرتے ہیں ضرورت ہو گی تو اجناس منگوا لیں گے۔ کسی طرح کا خیال نہ کرنا۔ تھوڑا لکھا بہت جاننا۔ رشید حمید کو پیار۔ پاپا حسینی کو بہت یاد کرتی ہے"

تمہارا خادم

دھنپت پراشر

لمبردار پہلے تو خاموش رہا۔ مگر پھر بولا "حسینا نے جواب تو دیا ہوگا۔
اس کا منشا کیا ہے۔؟"

مولوی صاحب نے پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں کہا
جواب تو مجھی سے لکھوایا تھا۔ لفظ بہ لفظ تو یاد نہیں۔ نقل نہیں رکھی مگر مفہوم
کچھ اس طرح کا تھا کہ "راجہ بھوج کی نسل سے ہوں۔ تھوک کر کیسے چاٹوں؟
گاؤں میں آباد ہو جاؤ تو اور بات ہے ہدیہ واپس لے لوں گا۔ روپے
لے کر زمین واپس کردوں گا۔ انسان ایک دوسرے کے کام آنے کے لئے
پیدا ہوا ہے، آجاؤ۔ زمینداری میں ہاتھ بٹاؤں گا۔ کہاں زمینداری کہاں
مزدوری! سن کر دکھ ہوتا ہے"

لمبردار نے خوش ہو کر کہا "پھر بات تو بن گئی، دحنپت آجائے تو ٹنٹا
مٹ جائے اور غازی مالدیو کی بیٹی غیروں کے ہاتھ پڑنے سے بچ جائے
اور پھر مولوی صاحب سے مخلصانہ انداز میں کہا "آپ میرا ہاتھ بٹائیں
تو یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

مولوی صاحب نے کہا "آپ کی رائے درست ہے۔ میں حاضر ہوں
پنڈت جی!"

لمبردار گھر آیا تو لمبردارنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور نائن مٹھیاں بھر
رہی تھی اور لے میں گا رہی تھی "رانگھڑ گوجر دو۔ کتا بلّی دو۔ یہ چاروں نہ
ہوں تو کھلے کواڑوں سو" لمبردارنی نے ہنس کر کہا "کیا تو نے نہیں سنا
"یا بسے گوجر یا رہے اجاڑ" اتنے موذی ہوتے ہیں یہ"

یہ سُن کر لمبردار کے کان کھڑے ہو گئے ۔ نائن تو لمبردار کو دیکھتے ہی کھسک گئی مگر لمبردارنی چونک کر چارپائی پر بیٹھ گئی

لمبردار نے چلاّ کر کہا "سمجھ میں نہیں آتا تم نائن کے ساتھ مل کر کیا طوفان اٹھا رہی ہو ۔ میں اس کا آنا جانا حکماً بند کردوں گا ۔ آیندہ اسے منہ نہ لگانا"

لمبردارنی بولی "ہیں ہیں! اتنا ظلم! بیچاری کا خاوند اور بیٹا جیل میں ہیں مانگ تانگ کر پیٹ بھرلی ہے ۔ رونا جھونا دیکھا نہیں جاتا ۔ بس تھکی ماندی تھی ۔ مٹھیاں بھرنے کے لئے بلا لیا ۔ تو نے پتھّر کا دل کیوں کر لیا؟"

لمبردار نے خفا ہو کر کہا "کیا بکتی تھی وہ رانگھڑ گوجر... اور کیا کہتی تھی تو؟"

لمبردارنی نے تڑق کر جواب دیا "جاکی ہنڈی، واکی منڈی ۔ نمک حرام تھوڑی ہے، جس کا کھائے گی اس کا گائے گی ۔ گوجر بیہودہ بکتا پھرتا ہے ۔ تجھ سے تو کچھ بنتا نہیں ۔ تو تو نام کا لمبردار رہ گیا ۔ پچھمن گنڈا سے طے کر آئی ہے وہ گوجر کو ایسا ٹھیک کریں گے کہ عمر بھر یاد کرے گا ۔"

اتنے میں رمیش آگیا ۔ شراب پی رکھی تھی ۔ پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور دونوں بدمعاش اس کے ساتھ تھے ۔ لمبردار یہ دیکھ کر کانپ اٹھا ۔

حسینا کا خط آیا کہ ہمارے گھر میں بہار اتر آئی ۔ باپ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا ۔ خط کو بار بار خود پڑھا، مجھ سے پڑھوایا اور جو سمجھ میں نہ آیا کسی فارسی داں سے سُن سمجھ آیا ۔ مگر پھر بھی اسے چین نہ آیا ۔ اٹھتے بیٹھتے خط ہی کا سمرن (وظیفہ) رہتا ۔ خط کا مضمون یہ تھا :-

"مکرم و محترم ۔ سلام مسنون ۔ قدرت کا تقاضا ہے کہ اشیاء

عالم تسلسل و ترادف کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ رہیں زمین، چٹانوں، ریت، فلز خام اور نمک سے بنی ہوئی ہے اور انہی اجزاء و عناصر سے قائم ہے۔ درخت پودے جڑی بوٹیاں اور ہر طرح کی نمو کا انحصار زمین پر ہے۔ مویشیوں کا نباتات پر۔ زمین پودوں کی پرورش کرتی ہے۔ پودے کیڑوں مکوڑوں کی غذا بن جاتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے پرندوں کی۔ پرندے وحشی حیوانوں کی۔ وحشی حیوان کرگسوں کی۔ کرگس کیڑے مکوڑوں کی کیڑے مکوڑے پودوں کی۔ اور پودے زمین کی۔ اور انسان جو ان سب پر حاوی ہونے کی کوشش میں ہے بالآخر انہیں کا نوالہ بن جاتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ دنیا ایک دوسرے کے سہارے چل رہی ہے۔ ہم سینکڑوں ایکڑ زمین میں گندم بوتے ہیں۔ یہ صرف اپنے لئے نہیں ہوتا۔ دوسروں کے لئے بھی ہوتا ہے بلکہ زیادہ دوسروں کے لئے، کم اپنے لئے۔ یہی کیفیت گڑ، شکر، مسور اور دوسری اجناس کی ہے۔ منشائے ایزدی یہی ہے کہ انسان ایک دوسرے کے کام آئے۔ ایک دوسرے کے لئے زندہ رہے اور ایک دوسرے کے لئے مرے۔ یہی سب سے بڑی عبادت ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست　　　به تسبیح و سجاده و دلق نیست

۱؎ ترجمہ "بھگتی ہے سیوا کا نام　　　مالا پوجا کو پرنام"

میں تمہارا دوست ہوں۔ بحیثیت انسان اور دوست کے مجھ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ تمہارے دکھ درد میں تمہارا ساتھ دوں۔ میں تمہاری طرح عالی خاندان سے ہوں، راجہ بھوج کی اولاد۔ زمین کا ہدیہ تمہارے نام کر چکا ہوں "سارے جسم میں زبان ہی حلال ہے" زبان بگڑنے نہ دوں گا۔ بگڑ جائے تو باقی کیا رہا۔ جگ ہنسائی مول نہ لوں گا۔ اگر تم آجاؤ تو بات دوسری ہے۔ روپے لے کر زمین واپس کر دوں گا۔ کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔ کہاں مزدوری کہاں زمینداری۔ دکھ ہوتا ہے۔ اس لئے تم پر واجب ہے کہ واپس آجاؤ اور اپنی زمین سنبھال لو۔ روپے کا تردد نہ کرنا۔ بعد کو دیکھا جائے گا۔ ہم بھائیوں کی طرح اکٹھے رہیں گے۔ اور چاہو گے تو ہمارے گاؤں میں ہی رہ لینا۔ خط کا جواب جلد دینا۔

خط از طرف حسینا گوجر۔ بقلم مولوی غلام رسول مدرس اول گاجی پور۔ ساکن لستان تحصیل شکر گڑھ ضلع گورداسپور۔ ملک پنجاب۔ وصینت کو سلام۔ نکو لکھی کو دعوات۔ مضمون واحد"

اس خط کا مابعد کو یہ اثر ہؤا کہ باپ گم صم رہنے لگا۔ وطن کی یاد، اپنی زمینداری، حسینا کا پیار، مولوی صاحب کا اخلاص، اور پرانے نہ بھولنے والے مشاغل اسے ستا رہے تھے۔ اور رہ رہ کر اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں ماں دیکھتی اور خاموش رہتی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے اس نے سکوت توڑا اور

کہا " بھلا بتاؤ اس سے کیا فائدہ ؟ کیوں ہلکان ہوتے ہو۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ ہم نے حسینا کا کاغذ واپس کر دیا۔ حساب چکا دیا۔ سبکدوش ہو بیٹھے۔ تم کماتے ہو ہم کھاتے ہیں۔ اچھی خاصی گزران ہو رہی ہے۔ لڑکے پڑھتے ہیں۔ عافیت سے گزر رہی ہے۔ اب ہم واپس جانے کے نہیں۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے۔ اسے لکھ دو۔"

باپ نے کہا " ہر چند پرانی یادوں نے دکھی کر دیا تھا۔ مگر میں نے بھی یہی سوچ رکھا تھا۔ تمہارا منہ تک رہا تھا کہ کچھ کہو تو لکھوں۔ تمہارے کہے مطابق اب لکھ دوں گا۔"

" ہاں لکھ دو" ماں نے کہا " حسینی کو میرا اسلام لکھ دینا، بھولنا نہیں"

ماں اپنے دھندے میں لگ گئی اور باپ ٹھیلا لے کر چل دیا۔ آخر سوچ بچار کے بعد اس نے حسینا کو یہ خط لکھا۔

" میرے پیارے دوست میاں حسینا جی! نکو لکھمی کا پرنام مایا کا سلام۔ مایا حسینی کو بہت یاد کرتی ہے تمہارا خط آیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ تم نے ٹھیک لکھا ہے کہ آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہیئے یہ صرف تمہارے ایسے اچھے آدمی ہی کر سکتے ہیں۔ تم ہر وقت ہمارے کام آتے رہے ہو۔ تم نے ہمارے ڈوبتے بیڑے کو بچا لیا اور ہماری الجھنوں کو خوش اسلوبی سے نمٹا دیا تھا۔ امید ہے آیندہ بھی ہمارے آڑے آتے رہو گے۔ لڑکے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ہمارا روزگار رفتہ رفتہ بہتر سے بہتر ہو رہا ہے۔ ہمارے

لئے اب شہر کو چھوڑنا ممکن نہیں۔ اور مایا کہتی ہے کہ یہ فیصلہ اٹل ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ یہاں دنیا کے کونے کونے سے لوگ زیارت، تجارت، سیر و تفریح کے لئے آتے جاتے رہتے ہیں میلوں تہواروں کی رونق رہتی ہے۔ دیوالی کی رات میں شہر چراغاں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ اور ہر مندر کے تالاب اور درگیانہ مندر کے سرور میں روشنی کی جھلملاہٹ قابلِ دید منظر بن جاتا ہے۔ بیساکھی دسہرہ، رام نومی، پیپلی صاحب کا میلہ، اماوس کا اشنان، عید، محرم، ہولی، راگ سبھا، ہنڈولے یہاں کے مشہور تہوار ہیں۔ درگیانہ مندر میں ہری نام کی مہما رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے اپنے دھندوں میں مصروف رہنے کے عادی ہیں نہ ہڑ ہڑ نہ کھڑ کھڑ۔ اپنے اپنے قدح کی خیر مناتے ہیں۔ رواداری مساوات اور اخلاص کا دور دورہ ہے۔ مذہبی جھگڑے ہیں نہ تعصب اور تنگ نظری کے مظاہرے۔ یہاں کے مندر بھی "گاجی پور" کے مندر اور یہاں کا خدا بھی "گاجی پور" کے خدا سے نرالا ہے۔ وہ ربّ العالمین ہے سب کی ساجھی میراث۔ دربار صاحب کے سنہرے دروازے ہر کہ ومہ کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ رکاوٹ یا مناہی کسی کے لئے نہیں۔ پربھو نام کی مہما (حمد) کے گیت وردِ زبان رہتے ہیں۔ متبرک گرنتھ صاحب کے اوراق پر ہندو مسلمان اچھوت بھگتوں (بزرگوں) حتیٰ کہ سدنا قصائی

کے پاکیزہ اقوال انقابن کر جلوہ گر ہیں اور ایک سفید ریش بزرگ ان کا سمرن (وظیفہ) کرتا رہتا ہے۔ اس کے عین دائیں طرف مسلمان ربابی طبلہ سارنگی اور ہارمونیم سے وہ وجدانی کیفیت پیدا کر رہے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بھلا تم ہی بتاؤ ایسے سازگار ماحول اور پاکیزہ فضا کو چھوڑ کر کوئی کہاں جائے؟

میری رائے میں موجودہ دشواری کا حل صرف یہی ہو سکتا ہے کہ تم روپے لے کر زمین لمبردار کو دے دو۔ تاکہ کشیدگی نہ بڑھے۔ غازی مالدیو کی بیٹی اس کے حقداروں میں چلی جائے تو انہیں شکایت نہ رہے گی۔ مولوی صاحب کی خدمت میں سب کا سلام۔ واضح ہو کہ نکو، لکھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ہم آپ کا احسان نہ بھول سکتے ہیں اور نہ چکا سکتے ہیں۔ فقط

آپ کا سیوک (خادم)

دھنپت پراشر

لمبردار کا خط آیا۔ اس نے بھی زمین سے متعلق لکھا اور گاؤں میں آنے کی پُرخلوص دعوت دی۔ باپ نے رسمی سا جواب دے دیا کہ "میرا آنا تو بعید از قیاس ہے۔ اراضی حسینا کی ہو چکی ہے اس پر میرا عمل دخل نہیں رہا۔ آپ براہِ راست بات چیت کر لیجئے، شاید وہ آپ ہی کو دیدے" اس فیصلہ کن قدم کے بعد ہم مطمئن ہو کر اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ میں اور لکھی پڑھائی لکھائی میں، ماں گھر کے کام کاج میں اور باپ محنت مزدوری میں

زمانہ سازگار تھا۔ ہماری آمدنی بڑھتی جا رہی تھی اور ہم دونوں بھائی ذہنی اور جسمانی طور پر بلند ہو رہے تھے۔ کہتے ہیں غذا ہی سے رنگ روپ نکھرتا ہے۔ ہماری غذا سادہ تھی مگر اس میں دودھ، دہی مکھن، ساگ سبزی کی مقدار کافی ہوتی۔ اس لئے ہماری صحت قابلِ رشک تھی۔ ہمارے چہرے شگفتہ رہتے تھے اور ہمارے جسم توانا اور مضبوط۔ لکھنّی اس پہلو میں مجھ سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ الغرض ہمیں ہر طرح کی تسکین و راحت حاصل تھی

کچھ عرصے کے بعد گھر میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ سکون کے زیرِ سطح بے چینی کی ایک ہلکی ہلکی لہر اٹھنا شروع ہو گئی۔ واقعہ یہ تھا۔ باپ ایک دن خلافِ معمول دیر تک نہر سے واپس نہ آیا۔ ماں پریشان ہو گئی اور والد کی تلاش میں نہر کی طرف چلی۔ سو سو طرح کے وسوسے اس کے جی میں اٹھ رہے تھے۔ جب گھی منڈی کے دروازے پر پہنچی تو باپ کو گندے نالے کے پُل پر بیٹھا پایا۔ دیکھ کر جان میں جان آ گئی۔ اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اتنے میں باپ نے بھی دیکھ لیا اور اٹھ کر اس کی طرف دوڑا۔ ماں نے پوچھا "کیا بات تھی؟ کس کا انتظار ہے؟ اتنی دیر لگا دی؟ میں تو گھبرا گئی۔ جان پر بن گئی کہ تمہیں ڈھونڈنے نکل آئی"

باپ نے کہا "بات تو کوئی نہ تھی۔ یہ مخملی ڈبہ پُل کے نیچے پڑا پایا تھا مالک کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ تم آ گئیں۔ مل جاتا تو اسے دے دیتا"

ماں نے ڈبہ تھام کر کہا "خیر کوئی بات نہیں کھانا کھا کر پھر آ بیٹھنا۔ اگر بھول گیا ہے تو آئے گا ضرور۔ اسے دے دینا۔ اسیس (دعا) دے گا"

باپ ساتھ چل دیا۔ ہم اسکول سے آئے تو تالا پڑا پایا۔ حیران رہ گئے

سنش و پنج ہی میں تھے کہ پہلے ماں آگئی اور بعد کو باپ۔ ہمسایوں نے میری ماں کے ہاتھ میں ڈبہ دیکھا تو سمجھے کہ زیور خرید کر لائی ہے۔ اور ایک نے تو پُوچھ بھی لیا۔ ماں نے کھانا پروسا اور باپ نے کھانا شروع کر دیا۔ ماں نے انجانے میں ڈبّہ کھولا اور ہار گلے میں ڈال لیا۔ ماں کے چہرے پر خوشی کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی، کہ وہ لفظہً نور بن گئی۔ اس کے حُسن کی تاب نہ لائی جاسکتی تھی۔ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور بے تابانہ اس سے لپٹ گیا۔ للّتی بھی ہکّا بکّا رہ گیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد باپ نے ماں کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا، مسکرایا اور کہا "نکّو کی ماں! جاؤں کیا؟" وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ تامّل کے بعد باپ ٹھیلا لے کر چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ خلافِ توقع اس کے قدم گندے نالے کے پل کی طرف نہ تھے بلکہ وہ چوک کی طرف جا رہا تھا۔ اور ہار ماں کے گلے کی زینت بنا ہُوا تھا۔ ماں کچھ دیر بعد اٹھی، اور آئینہ دیکھ کر متحیّر رہ گئی۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "اوئی! میں! مایا!" ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ لاجونتی آگئی وہ دیکھ کر بھوچکا رہ گئی۔ اور کہا "مایا! تو تو آج دلاری بن گئی۔ اِندر کی اپسرا (پری) آ تیرا منہ چوم لوں۔ یہ ہار کتنے میں لیا؟ جڑاؤ ہے، ہزار سے کم کیا ہوگا"

ماں کیا کہتی کہ پرایا مال ہے۔ جھینپ سی گئی اور کہا "معلوم نہیں، وہ لے آئے ہیں نے پہن لیا۔ کیا جانوں کتنے کا مال ہے"

اتنے میں محلّے کی اور عورتیں بھی آگئیں۔ سب نے ہار کی تعریف کی

اور ہار سے زیادہ ماں کی کہ "گہنے نے تو چار چاند لگا دئے"۔ جاتے جاتے لاجونتی نے کہا "بہن اب چار چار چوڑیاں بھی پہنوا لے۔ کانچ والے ہاتھ بُرے لگتے ہیں۔"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا خاموش ہو رہی۔ اگرچہ اس لاوارث مال کی موجودگی کا احساس سب کو رہتا مگر لب پر کوئی نہ لاتا۔ بات چل پڑتی تو ماں کا رنگ اڑ جاتا۔ گھر میں یہ مال طیب ہی سمجھا جانے لگا۔ باپ نے بزعم خود ضمیر کی ملامت سے بچنے کا یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا کہ گھی منڈی کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ چکر کاٹ کر سلطان ونڈ کی نہر کی طرف جانا شروع کر دیا۔ گھی منڈی کا کام بھی ملتا تو ٹال دیتا اور بھولے سے بھی ادھر کا رُخ نہ کرتا۔ ماں باہر جاتی تو ہار چھوڑ جاتی کہ اصلی مالک پہچان کر چھین نہ لے۔ غرض کہ نہالی کی غبن کی داستان ایک نئے رنگ میں دوہرائی جانے لگی۔ والدین نے خود فریبی کا لبادہ اوڑھ لیا اور ہار کو "خدائی عطیہ" سمجھ کر خاموش ہو گئے مگر پھر بھی بے چین ہو کر رات کو بڑبڑا اُٹھتے ۔ ماں ہار کو حسن کی زیبائش سمجھتی تھی اور باپ کی خوشنودیٔ طبع کا باعث۔ باپ، ماں کی دل شکنی کے ڈر سے خاموش رہتا۔ دونوں اندیشے کو تھپکیاں دے دے کر سُلا دیتے اور آپ بھی مطمئن ہو کر سو جاتے۔

دنیا کا رنگ! دوستوں اور دشمنوں کے فریب ناقابل برداشت اور قابل مذمت بلکہ قابل نفرین سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اپنی خود فریبی کو کوئی دھیان میں نہیں لاتا۔ بلکہ جواز میں سینکڑوں دلائل اور تشریحات کا سہارا

ڈھونڈا جاتا ہے - وائے ما! اے وائے ما!!

نقاشیٔ فریبِ معاصی نہ پوچھئے
جنّت بنا کے رکھ دی گنہگار کے لئے

اس نے کہا "میرے بھائی! گوشِ ہوش سے سُن: سعدی نے اپنی گلستاں میں لکھا ہے "آوردہ اند کہ نوشیروانِ عادل را در شکار گاہے صیدے کباب می کردند و نمک نبود۔ غلامے را بردیہہ دوانیدند تا کہ نمک آرد۔ نوشیرواں گفت بہ قیمت بہ ستاں تا رسمے نہ گردد و دِہ خراب نشود۔ گفتند کہ ازیں قدر چہ خلل زاید۔ گفت بنیادِ ظلم اندر جہاں اوّل اندک بودہ است و ہر کس آمد برآں مزید کردہ تا بدیں غایت رسید۔ یعنی یہ: کہتے ہیں کہ نوشیروانِ عادل کے لئے شکار گاہ میں شکار کے کباب بنا رہے تھے اور نمک نہ تھا۔ غلام کو گاؤں کی طرف دوڑایا کہ نمک لائے۔ نوشیرواں نے کہا قیمت دے کر لانا تاکہ رسم نہ بڑھ جائے اور گاؤں ویران نہ ہو۔ لوگوں نے کہا اتنی کم مقدار سے کیا خلل پیدا ہوگا۔ بولا ظلم کی بنیاد پہلے جہان میں تھوڑی تھی۔ جو کوئی آیا اس کو بڑھاتا گیا تو نوبت موجودہ حد تک پہنچی۔

یہ لعنت نوشیرواں کے کہنے سے ختم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی جا رہی ہے
ہم سہواً یا قصداً ایک دوسرے پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ مگر مکافاتِ عمل
سے کون بچ سکتا ہے۔ افراطِ ستم سے پیمانے لبریز ہو جائیں تو آپ سے آپ
ہی چھلک جایا کرتے ہیں۔ لمبردار سر تھامے بیٹھ گیا تو رمیش اور اس کے
ساتھی رفوچکر ہو گئے۔ اس میں اٹھنے تک کی سکت نہ رہی تھی۔ کلیجہ اس کا
دھک دھک کر رہا تھا۔ لمبردارنی گھبرا گئی۔ جلدی سے چارپائی بچھا دی اور
اس پر لٹا دیا۔ لمبردار پر پے در پے غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ رمیش
رات بھر غائب رہا۔ صبح آیا تو شکر گڑھ سے ڈاکٹر کو ساتھ لے آیا۔ اس
نے معائنہ کے بعد کہا کہ "وجع القلب" کا شکار ہے۔ ناگہانی صدمے کے باعث
دل کے دورے پڑ رہے ہیں۔ اور دل ڈوبا جا رہا ہے۔ مرض مہلک ہے مگر
خدا شافی ہے۔ اس کے گھر میں کیا کمی! مریض کو دوا سے کہیں زیادہ ذہنی اور
جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔" مگر لمبردار کو ذہنی آرام کہاں؟ آنکھیں کھولتا تو
لمبردارنی اور رمیش سامنے دکھائی دیتے۔ بے چین ہو جاتا اور غشی طاری ہو
جاتی۔ ڈاکٹر ۸۔۱۰ دن آتا رہا۔ کوئی افاقہ نہ ہوا۔ دیسی علاج کیا پھر عطائی
آئے اور بعد کو جادو ٹونے والے، مگر بے کار۔ آخر اکیسویں دن "مردار بود
کسے کہ او را نہ کشند"[1] کی تکمیل میں اور اپنے اعزہ و اقارب کی بداعمالیوں سے
دل برداشتہ ہو کر خدا کو پیارا ہو گیا۔ گاجی پور اور نواح میں کہرام مچ گیا۔ لوگ

---

[1] ترجمہ قتل ہونے سے مرد ہے مقبول وہ ہے مردار جو نہیں مقتول

مرنے والے کی خوبیاں اور برائیاں بیان کر کے روتے تھے۔ لمبردارنی اپنی حماقت کا انجام دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔ کوئی پوچھتا بھی تو کیا کہتی۔ چپ سادھ لیتی اور بغلیں جھانکنا شروع کر دیتی۔ لمبردار کا جنازہ دھوم سے نکالا گیا۔ اور کندھا دینے والوں میں لچھمن گنڈا بھی تھے جو رمیش کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ کریاکرم کے بعد رمیش نے لمبردار کی جگہ سنبھال لی۔ شراب کے دور چلنے لگے اور دیوان خانہ بدمعاشی کا اڈہ بن گیا۔ لمبردارنی چیختی چلاتی مگر اس کی کون سنتا۔ اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم[1] کی کیفیت بن چکی تھی۔ اس کی دلجوئی کا سامان صرف نائن ہی تھی وہ اسی کے ساتھ چمٹی رہتی۔ اور رمیش من مانی کرتا رہتا۔ لمبردارنی نے اپنے ہاتھوں خانہ برباد کر لی اور یہ نہ سوچا کہ اس کا سہاگ اس کے اپنے ہاتھوں لٹ گیا۔ اور خاوند کی موت اور بیٹے کی بے راہ روی کا عذاب بھی اس کی گردن پر مسلط ہے
باپ کا خط حسینا کو ملا تو لمبردار فوت ہو چکا تھا۔ ماتم پرسی کے لئے حسینا بھی گیا۔ اسے لمبردار کی بے وقت موت کا از حد ملال ہوا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ لمبردار کی خواہش کے احترام میں زمین اسی کے وارثوں کو دے دوں گا۔ اگرچہ اس دوران میں قیمتیں بڑھ چڑھ گئی تھیں، مگر وہ پہلے داموں پر ہی زمین دینے پر راضی تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اس عزم کو عملی جامہ پہناتا، لچھمن اور گنڈا نے اکیلا پا کر اسے گھیر لیا اور لاٹھیاں مار مار کر کچومر نکال دیا۔ اور ادھ موا کر کے بھاگ گئے۔ کسی راہ گیر نے پہچان کر گاؤں والوں کو بتا دیا۔ وہ اسے گھر لے آئے۔ اور بعد کو شکر گڑھ کے شفا خانے

---

[1] بے بسی مراد ہے

میں داخل کرا دیا۔ پولس بیان لینے آئی تو جیتنا نے صرف یہ کہا کہ کسی سے دشمنی بیر نہیں۔ حملہ آور منہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ مارپیٹ کر بھاگ گئے۔ میرے ہوش وحواس قائم نہ رہے پہچان نہ سکا۔ کس کا نام لوں؟ ۱۸ دن کے بعد جیتنا کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی اور وہ گھر آگیا۔ ہرچند اس کے متعلقین نے زور لگایا مگر اس نے سانحہ سے متعلق لب وا نہ کئے۔ وہ جانتا تھا کہ لمبرداری کی آکساہٹ اور روپے کے لالچ میں آکر لچھمن اور گنڈا نے اس فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ مگر ڈرتا تھا کہ اگر اس کے حمایتیوں اور متعلقین کو پتا لگ گیا تو بات بڑھ جائے گی اور ایک کے کئے کی سزا بہتوں کو بھگتنی پڑے گی اور پرانشر گھن کی طرح پس جائیں گے اسی لئے جب مولوی صاحب نے پوچھا تو وہ ٹال گیا اور حملہ آوروں سے متعلق لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

مثل مشہور ہے "زن زمین زر تینوں لڑائی کے گھر" یعنی یہی تین چیزیں ہیں جن سے شر اٹھتا اور فساد بڑھتا ہے۔ بادی النظر میں یہ نظریہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی جتنی چھوٹی یا بڑی لڑائیاں لڑی گئی ہیں ان کی تہ میں ان میں سے ایک یا دو یا تینوں چیزوں کے حصول کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ عوام و خواص میں یہی فساد کی جڑ یہی سمجھی جاتی ہیں۔ کسان زمین پر مرمٹتا ہے۔ بھائی تک کو قتل کر دیتا ہے۔ بنیا زر کے لئے سو سو طرح کے داؤ پیچ کھیلتا اور مکر کے جال بچھاتا ہے۔ غرض مند زن کے لئے کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ جیتا کسان تھا پشتینی کسان چلا آتا تھا۔ زمین ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ ہاتھ آئی زمین کو کیونکر چھوڑتا؟ مگر نہیں وہ تو چھوڑنے پر تلا ہوا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس

سانحہ کے بعد رویہ بدل لیتا۔ رمیش اور لمبر دارنی کو وہ ناک چنے چبواتا کہ ساری عمر یاد رکھتے۔ مگر اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور وہ اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے لمبردارنی کو کہلا بھیجا کہ "وصیت کے حکم کی تعمیل میں اراضی دینے کو تیار ہوں، اگرچہ قیمتیں بڑھ گئی ہیں، اصل زر لے کر انتقال کروا دونگا۔ کھڑی فصل پر میرا حق ہے وہ مجرا لے لوں گا۔" لمبردارنی کو پہلے تو یقین نہ آیا۔ نائن بول اٹھی "کمینہ جوتے کھائے بغیر کہیں سیدھا ہوتا تھا۔ جوتے کھائے سیدھا ہو گیا۔ نہ سیدھا ہوتا تو اور کھاتا۔ پھر مانتا کیوں نہ؟"

لمبردارنی نے خوش ہو کر کہا "ہمیں اور کیا چاہیئے۔ رمیش باہر گیا ہوا ہے، نہ معلوم کب آئے۔ زمین اپنے نام لکھوا لیتی ہوں۔ نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ کسی کے بہکاوے میں نہ آ جائے کہیں!"

نائن نے کہا "لکھوا لو مگر فصل کی بات نہ مانوں گی وہ تو میرا حق ہے"

لمبردارنی نے نرمی سے کہا "دیکھ رانی! دام بھی تو کم لیتا ہے، جھگڑا اچھا نہیں، زمین لکھوا لوں بعد کو دیکھا جائے گا"

نائن نے منہ بنا کر کہا "لکھی گئی تو بعد کو کچھ نہ بنے گا۔ اس وہم میں نہ رہنا۔"

لمبردارنی نے تامل کے بعد سنجیدگی سے کہا "بات بننے دے تجھے خوش کر دوں گی۔ بات بگڑ گئی تو زمین پلے نہ پڑے گی۔ جانتی ہوں موذی ماننے والا نہ تھا۔ جوتوں نے منوایا۔"

نائن نے کہا "پھر جو تیری مرضی۔ میں اپنا حق لے لوں گی۔ دیکھ کہہ دیا

تجھے!"

روپے دے کر لمبردارنی نے اراضی اپنے نام لکھوالی۔ اسی شام دیکھنے چلی گئی۔ لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر شاداں و فرحاں لوٹ آئی اور دیر تک زمین سے متعلق باتیں کرتی رہی۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نائن اپنا "حق" لیے بغیر نہ اٹھی۔

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفل ہا" بات پھیل گئی کہ حسینا کو لمبردارنی کے ایماء پر زدوکوب کیا گیا تھا۔ اور نائن ہمراز تھی۔ مارنے والوں کا پھر بھی کچا پتا نہ لگ سکا۔ حسینا کے متعلقین کو جب زمین سے متعلق علم ہوا تو بہت برانگیختہ ہوئے۔ اور اسے جھنجھوڑ کر کہا "کیوں بے! جوتے بھی کھائے، کورے استرے سے سر بھی منڈوالیا۔ زمین بھی بھس کے بھاؤ لٹا دی۔ بے شرم کہیں کا۔ تجھ سا احمق بھی کوئی کیا ہوگا؟" بیچارہ خاموش رہا، کیا جواب دیتا۔ !

باپ کو لمبردار کی موت اور حسینا کی مار پیٹ کا پتا لگا تو بہت آزردہ ہوا۔ رات کا کھانا بھی نہ کھایا اور گاؤں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ مگر ماں نے روک دیا اور کہا "بھلا جس فساد سے ڈرتے تھے اسی میں اب کیوں کودتے ہو۔ ہمارا آسرا تو تمہیں ہو، ہرج مرج ہوگیا تو ہم کہاں جائیں گے؟ ان معصوم بچوں کا کیا بنے گا؟ جائے بھاڑ میں۔ ہیں تو نہ جانے

ف ترجمہ: تیسرے تک جب گیا رازِ نہاں کچھ بھی نہیں

دوں گی۔ حسینا اب بھلا چنگا ہے۔ شکر کرو بچ گیا۔ لمبردار بیچارہ مر گیا
بہت برا ہوا۔ ہڈیاں گنگا پہنچ گئیں۔ اب کیا واپس آئیں گی۔ اور نہ تم
اسے دوبارہ زندہ کر سکو گے۔ اگر رونا ہے تو یہیں بیٹھ کر رو لو۔ تھک
جاؤ گے تو پانی سے منہ دھلوا دوں گی۔ فاقے کرنے ہیں تو دو چار اور
کر لو۔ میں بھی شامل ہو جاؤں گی۔ گھر کی بچت ہو جائے گی۔ جانا چاہو تو
یہ نہ مانوں گی۔ تمہارا راستہ روک لوں گی۔" باپ چپ ہو گیا۔ اور
ارادہ ترک کر دیا۔ ہاں حسینا اور رمیش کو خط لکھ دئے۔ ایک کو خیریت
کا اور دوسرے کو تعزیت کا۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ساون کا مہینہ تھا۔ بارش ہو رہی تھی
ماں گنگنا رہی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا گا رہی ہو؟" کہنے لگی "ساون کی
چھٹی کا دن ہے۔ ایک برہ کی ماری کا گیت یاد آ گیا ؎

اور بھی لگائی آگ ساونی نے پھول کر
پیڑ پر مری نظر پھر پڑے نہ بھول کر

ساون کی جھڑی، ساونی کا میلہ، لڑکیوں کا رنگ برنگ لباس، ان کے
شگفتہ چہرے، مل کر گانا، ہنڈولوں کی بہار، سب کچھ ایک ساتھ یاد آ گیا
کتنے اچھے تھے وہ دن"

میں نے شرارتاً کہا "پتا جی تو گھر میں ہیں، برہ کی بات کیوں یاد آئی"
ماں نے مسکرا کر کہا "چپ شرارتی کہیں کا۔ ماں اور مسخری! ٹپنے کی
تو صلاح نہیں کہیں۔ اور کھو سی گئی"

میں نے کہا " میری صلاح تو آم کھانے کی ہے، پٹنے کی نہیں"
لکھی نے کدکڑے لگا کر میری تائید کر دی اور اسی شام آموں کا ٹوکرا آگیا۔ ہم نے جی بھر کر آم کھائے۔

بارشیں اس سال بہت ہوئی تھیں" آج برس کے پھر نہ برسوں" کی کیفیت تھی۔ بازار اور گلیاں پانی سے بھر گئیں۔ گھروں سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ ایک دن تو ایسا معلوم ہوا کہ ساتوں سمندروں کا پانی اُچھ کر زمین پر آگیا ہے۔ ڈھلوان کی بستیاں پانی تلے دب گئیں۔ اگرچہ ہماری گلی اونچی سطح پر تھی، پھر بھی پانی بھر گیا۔ اور ہم گلی والوں کے ساتھ دربار صاحب کے ایک " بنگاہ" میں چلے گئے۔ ریلوں کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ اور آمد و رفت کے سلسلے ٹوٹ گئے۔ ایک دن باپ ایک اخبار تھامے دوڑا آیا۔ اس کے حواس قائم نہ تھے۔ وہ آتے ہی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ ماں نے دوڑ کر اسے سنبھالا۔ ہم نے رونا شروع کر دیا۔ اِدھر اُدھر کے لوگ جمع ہو گئے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو اس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اخبار دیکھا تو اس کی سرخی یہ تھی :-

دریائے راوی کی تباہ کاریاں۔ گاجی پور دریا برد ہو گیا!
دربار صاحب کرتار پور خطرے میں

ہم سب سہم گئے۔ گاؤں اور دریائے راوی ہماری آنکھوں کے آگے پھرنے لگے۔ لوگ چلے گئے تو ماں نے دھیرج (تسلی) دیتے ہوئے کہا " بہت بُرا ہوا۔ بزرگوں کا نام تک مٹ گیا۔ ننھے ننھے معصوم بچے، ناتواں

بوڑھے، ہنستے کھیلتے نوجوان بے زبان مویشی سب غرق ہو گئے پرماتما کا قہر!"
باپ نے آہ بھر کر کہا" راوی مجھے بہت پیارا لگتا تھا - اس کی البیلی چال
تندی، ٹھنڈا میٹھا پانی بہت ہی بھاتا تھا۔ بطور "چرن امرت" پینے کا عادی تھا
ناغہ نہ کرتا تھا، مگر آج اس سے انتہائی نفرت ہو گئی۔ پہلے بھی اس نے
بیسیوں گاؤں برباد کئے، ہزاروں جانیں لے لیں - آج لیکھم پور، قلعہ،
مصدی والا، چنڑ پور کہاں ہیں؟ یہ گاؤں میرے دیکھتے دیکھتے تباہ ہو گئے۔
مگر اس وقت میری آنکھیں نہ کھلیں - اس بدبخت ظالم کو اس کے اصلی روپ میں
میں نے آج دیکھا - پرماتما اسے غارت کرے" یہ کہتے کہتے باپ کی آنکھیں
بھر آئیں -

ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا" کیا معلوم! اخباری خبر ہی تو ہے !
پرماتما کرے سرے سے ہی جھوٹی ہو - پوری خبر آ لینے دو"

باپ نے کہا" نہیں اب مجھے جانے دو"!

ماں نے باپ کی طرف غور سے دیکھا - اندازہ کر لیا کہ اب وہ رکنے کا نہیں
تو جھجکتے جھجکتے کہا" ہاں جانا تو ضرور چاہیئے میں بھی ساتھ چلوں گی. مگر پوچھ لو
راستے بھی کھلے ہیں یا نہیں؟"

باپ تسلی کر آیا کہ راستے کھلے ہیں - اپنی شان دکھانے کے لئے
ماں نے پہلے نو ہار ساتھ لے جانا چاہا، مگر پھر ڈر گئی کہ کوئی انہونی نہ ہو
جائے - اور ہار ہی ہاتھ سے نکل جائے - ارادہ ترک کر دیا اور یہیں چھوڑ
گئی - وہ چھ بجے کے ڈبے میں بیٹھ کر سات بجے گاؤں پہنچ گئے۔ منظر

بڑا بھیانک تھا۔ گاؤں کا نشان تک مٹ چکا تھا۔ دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مویشی تو ختم ہو چکے تھے کچھ پراشر اور مہاشے بچ گئے تھے۔ ان کا حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ اس بربادی کے بعد بھی ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ پڑے تھے میرا باپ انہیں دیکھ کر بہت آزردہ ہُوا۔ اور ماں سے مشورہ کرکے پچیس روپے پراشروں اور پندرہ مہاشوں کو دے آیا۔ جینا باپ کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ اس نے بتایا کہ یہ آفت رات کے ایک بجے آئی تھی۔ بجی والے کا بند ٹوٹ گیا اور سیلاب کا رُخ گاجی پور کی طرف ہو گیا۔ لمبردارنی اور نائن کی لاشیں ایک ہی درخت سے چمٹی پائی گئی تھیں۔ اراضی کا کاغذ لمبردارنی نے مٹھی میں پکڑا ہُوا تھا۔ دربار صاحب کا گوردوارہ لوگوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بچا لیا۔ قدرت کا کرشمہ! کہ ایک غیبی ہاتھ بھی اس نیک کام میں لوگوں کا معاون و مددگار رہا۔ مولوی صاحب نہ مل سکے۔ وہ اپنی نئی تعیناتی کے سلسلے میں شکر گڑھ گئے ہوئے تھے۔ تاکہ کسی نزدیکی مدرسے میں لگ جائیں۔ جینا حسینی اور ان کے دونوں لڑکے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے اور ریل چھٹنے تک وہیں رہے۔ ماں کو گُڑ شکر اور گھی دیے گئے۔ ماں نے بھی بچّوں کو مٹھائی کے لئے روپے دئے اور بہت پیار کیا۔ جب ڈبّہ راوی کے پل سے گذرا تو باپ نے کھڑکی سے سر نکال کر دریا میں تھوک دیا۔ اور ماں نے "اس کا ہوا ناس ہو جائے" کہہ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔ مگر دریا کی روش اور روانی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح ٹھاٹھیں مارتا تیزی اور تندی سے رواں دواں رہا۔ اس کے بعد باپ نے نہر کا کبھی رُخ نہ کیا۔ بازار کے نل تلے ہی نہا لیتا مگر وہ گاؤں کو نہ بھول

سکا۔ رہ رہ کر یہ یاد دل میں اٹھتی اور اسے پژمردہ کر دیتی وہ بھولنے کی کوشش کرتا مگر

تھم تھم کے کہہ رہی ہیں دم نزع ہچکیاں
کس کس کو بھولنا ہے ذرا یاد تو کرو!

میں اب سترھویں سال میں تھا۔ اور دسویں میں پڑھتا تھا میری مسیں بھیگ رہی تھیں۔ آٹھویں میں بھی وظیفہ لے لیا تھا۔ "میرا بھائی" خیر سے اب دسویں سال میں تھا۔ اور پانچویں میں امتیازی حیثیت سے پاس ہوا تھا۔ میرے ماں باپ اب ۴۵ کے پھیر میں تھے اور خدا کے فضل و کرم سے جسمانی طور پر تندرست تھے۔ ماں نے چار چھوڑ چھ چھ چوڑیاں پہن لی تھیں۔ اور باپ نے جوتا خرید لیا تھا۔ اور کبھی کبھار پہن بھی لیتا تھا۔ پٹکے کی بجائے گاہے ماہے سر پر پگڑی بھی رکھ لیتا تھا۔ ہمارے خورونوش اور رہن سہن میں تبدیلی آ چکی تھی۔ ہمارا لب ولہجہ بھی بدل رہا تھا۔ اور اب دیہاتی دکھائی نہ دیتے تھے۔ ہمارے پاس اتنا اثاثہ ہو گیا تھا کہ باپ مکان خریدنے کی ٹوہ میں رہتا۔ لاجونتی کے گھر میں ہماری فارغ البالی اور زیورات کے چرچے رہتے۔ اسے بھی ہمارا مستقبل درخشندہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی دوہتی کی نسبت میرے ساتھ ہو جائے۔ اشارۃً کنایۃً وہ کئی بار جتا بھی چکی تھی۔ اور ہمیں مرعوب و متاثر کرنے کے لئے اپنے داماد کی دولت و حشمت کی کہانیاں مزے لے لے کر بیان کرنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ مگر ماں ٹال دیتی حقیقت یہ ہے کہ میری منگنی ہو چکی تھی۔

ہری ہر ناتھ ہمارے اسکول کے سیکنڈ ماسٹر تھے۔ ذات کے برہمن تھے سیدھے سادے نیک انسان، وہ میری علمی اور جسمانی صلاحیتوں سے متاثر تھے ان کے ایک ہی اولاد تھی، بارہ سالہ لڑکی سرستی۔ وہ اس کے لئے مجھے منتخب کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے میرا خیال رکھتے۔ اسکول کے اوقات کے بعد لڑکوں کو پڑھانے کا دھندا بھی کرتے تھے۔ مجھے اور لکھّی کو بھی پڑھا دیتے۔ ان کی گھر والی بڑی نیک خاتون تھی۔ وہ بھی شفقت سے پیش آتی۔ ایک دن انہوں نے باپ کو بلا بھیجا اور میرے متعلق بات چیت کی اور کہا کہ "نکّو اچھا لڑکا ہے اور اگر اچھے راستے چلتا رہا تو رتبے پر پہنچ جائے گا۔ تعلیم اور حصولِ روزگار میں اس کی مدد کروں گا۔ میری بیوی چاہتی ہے کہ سمبندھ ہو جائے تو اچھا ہی ہے۔"

باپ ان کے خلوص، سادگی اور صاف بیانی سے بہت متاثر ہوا اور کہا "آپ نے ہماری بڑی عزت افزائی کی۔ ہم کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔ اجازت ہو تو نکّو کی ماں سے ذکر کر لوں۔"

ماسٹر جی نے کہا "مضایقہ نہیں! جلدی بھی نہیں! نکّو برسرِ روزگار ہو جائے گا تو شادی کرنا ہے۔ ویسے لڑکی بھی ابھی پڑھ رہی ہے۔ سوچ سمجھ لو، بعد کو بتا دینا۔"

ہمارے لئے یہ غیر متوقع بات تھی۔ باپ خوش خوش گھر آیا اور ساری کہانی سنا دی۔ ماں بھی خوش ہو گئی اور کہا "ہمارے دھن بھاگ (خوش قسمتی) ہمیں اور کیا چاہیئے۔" پھر ٹھٹک کر کہا "لڑکی دیکھ لوں تو بتاؤں، شاید نقص ہو"

آخر انہوں نے یہاں کیا دیکھا کہ تاولے ہو رہے ہیں"

ماں نے لڑکی دیکھ لی۔ باپ کو بتایا "میرا خیال غلط تھا۔ لڑکی سندر ہے۔ خاندان ہم سے دہ چند اچھا۔ اکیلی لڑکی ہے، سمجھ میں نہیں آیا......مگر ہمارا کیا لیتے ہیں تم "ہاں" کہہ آنا"

باپ نے جاکر ہاں کہہ دی اور عاجزی سے کہا "ہم غریب آدمی ہیں۔ ذرا دیکھ لینا! آپ کے لائق نہیں" ماسٹرجی نے کہا "بھائی دھنپت! ہم نے دیکھ لیا، بات پکّی ہوگئی۔ لڑکا ہمارا ہو لیا۔ چرچے کی ضرورت نہیں۔ اب کسی اور طرف نہ دیکھنا، مناسب وقت پر شگن دے دیں گے۔"

بات تو پکّی ہوگئی، مگر ماں متردّد رہتی کہ ماسٹرجی بڑے آدمی ہیں اور ہم معمولی مزدور۔ یہ ان میل جوڑ کس طرح سرے چڑھے گا۔ باپ سے ذکر کرتی تو وہ تسلّی آمیز الفاظ میں کہتا کہ "ماسٹرجی کی دور اندیشی! انہوں نے لڑکے میں کوئی گُن تو دیکھا ہوگا کہ رشتہ پیش کیا۔! ہم نے تو نہ مانگا تھا۔ تُو بدگمانی نہ کر۔" ماں یہ سن کر خوش ہو جاتی۔ مگر یہ وسوسہ اس کے دل سے دور نہ ہوتا۔

اس کے بعد ماسٹرجی نے میری پڑھائی کی طرف غیر معمولی توجہ دینا شروع کردی۔ امتحان کے دن قریب آئے تو انہی کے یہاں رہنے لگا۔ انہوں نے محنت میں دن رات ایک کر دیا۔ امتحان سے پہلی رات ہلکا پھلکا کھانا کھلا کر سُلا دیا اور کہا کہ برخوردار! امتحان میں ان باتوں کا ضرور خیال رکھنا کہ کارآمد ہیں۔ (۱) امتحان میں بیٹھنے سے پہلے اپنی جگہ کو رومال سے صاف کر لینا تاکہ ماحول ستھرا ہو جائے۔ (۲) قلم دوات قرینے سے سامنے

رکھ لینا کہ آسانی سے حل لکھ سکو (۳) پُرانا نب اور قلم قابلِ اعتماد چیز ہے ، نیا نب اکثر ٹھیک نہیں چلتا ۔ (۴) بیٹھتے ہی خدا سے رہنمائی چاہنا ، وہی کارساز ہے (۵) پرچہ ملنے پر اطمینان سے آہستہ آہستہ دوبار پڑھ لینا ۔ بے اطمینانی اور جلدی میں کچھ پلے نہیں پڑتا ۔ (۶) آسان سوال پہلے حل کر لینا مشکل بعد کو ، کوفت سے بچے رہو گے ۔ (۷) اختیاری سوالوں میں آسان کا انتخاب کرنا مشکل نظر انداز کر دینا ۔ (۸) خوش خطی کا خیال رکھنا ۔ (۹) وقت کے اختتام سے پہلے نہ اٹھنا ________ میں نے ان سود مند ہدایات کو پلے باندھ لیا ۔ اور گہری نیند سو گیا ۔ صبح اٹھا تو خوب تر و تازہ تھا ۔ نہایا دھویا ، بھجن گنگنایا ، دریں اثنا ، ماسٹر جی جا چکے تھے ۔ کھچڑی دہی کھایا اور چل پڑا ۔ دو قدم بھی نہ گیا تھا کہ پاؤں کسی چیز میں الجھ گیا اور دھڑام سے گندے نالے میں گر پڑا اور کپڑے لتھ پتھ ہو گئے ۔ ماسٹرانی صاحبہ بھاگی بھاگی آئیں مجھے پھر سے نہلایا اور ماسٹر جی کے کپڑے جو چوڑائی میں بڑے اور لمبائی میں چھوٹے تھے ، پہنوا دئے ۔ بازار کے لڑکوں نے دیکھا تو اودھم مچاتے میرے پیچھے ہو لئے ۔ اور مجھے بہروپیہ سمجھ کر آوازے کسنے لگے ۔ میں سرپٹ دوڑا مگر دوڑنا بھی تو دشوار تھا ۔ آخر گرتا پڑتا امتحان کے احاطہ میں آ پہنچا ۔ میری حالت قابلِ رحم تھی ۔ دم چڑھا ہوا تھا ۔ یہاں بھی لڑکوں نے مجھے گھیر لیا ۔ اور اگر ماسٹر جی دستگیری نہ کرتے تو میں امتحان دئے بغیر بھاگ آتا ۔ انہوں نے مجھے لڑکوں کے چنگل سے چھڑایا اور الگ لے گئے ۔ حال سنا تو تسلی آمیز الفاظ میں کہا " دوسرے پرچے

تک تمہارے کپڑے آجائیں گے فکر نہ کرنا، میرے کپڑوں کی لاج رکھنا حوصلہ
اور توجہ سے پرچہ حل کرنا۔ اوّل رہ کر ان بدتمیز لڑکوں کو تمسخر کا مزہ چکھا دینا"
جب تک میں اندر نہ چلا گیا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھے رہے۔
ہال میں داخل ہؤا تو ممتحن بھی میری ہیئت کذائی کو دیکھ کر بے اختیار
ہنس پڑے۔ اور میرے رول نمبر کو بغور دیکھنے لگے۔ مگر میں نے پروا نہ کی۔
ماسٹر جی کے ارشادات اور کپڑوں نے مجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ بھر دیا۔ میں
نے رومال سے جگہ صاف کی۔ قلم دوات قرینہ سے رکھی۔ خدا کے حضور دعا
کی کہ "کارساز! مشکل کشائی کرنا اور ان شرارتی لڑکوں سے زیادہ نمبر دلوانا
ماسٹر جی کے کپڑوں کو تبرکاً بوسہ دیا۔ اتنے میں پرچہ بھی مل گیا۔ میں نے
اطمینان اور غور سے پڑھا۔ دوسری بار پڑھا اور پھر تیسری بار۔ میری مشکلات آپ
سے آپ آسان ہوتی گئیں۔ سوال آپ سے آپ حل ہونے لگے۔ اور میرے دل
میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے آسان سوال پہلے حل کر لئے اور پھر دلجمعی
سے مشکل سوالات کی طرف متوجہ ہوگیا۔ برخاستگی سے دس منٹ پہلے میں
پرچہ حل کر چکا تھا۔ میں نے مشکل سوالات کی نظر ثانی کر لی اور مناسب تبدیلیوں
کے بعد پرچہ دے کر باہر آگیا۔ لڑکے سرگوشیوں میں مشغول تھے اور جوابات
کا مقابلہ و موازنہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پرچہ بھول گئے اور ادھر لپکے۔
اتنے میں ماسٹر جی آگئے۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ کپڑے بدلے، ناشتہ
کیا اور حل انہیں سنا دئے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ پرچہ اچھا ہوگیا ہے
باقی پرچے بھی میں نے اطمینان سے کر لئے۔ حساب کا حل پورے کا پورا ٹھیک

تھا۔ اور اتفاق سے جواب مضمون بھی پہلے کا دیکھا ہوا آ گیا۔ امتحان کے بعد چھٹیاں آ گئیں۔ مگر میری پڑھائی میں خلل نہ آیا۔ ماسٹر جی نے ایف اے کی کتابیں پڑھانا شروع کر دی تھیں۔

نتیجہ نکلا تو میں صوبہ بھر میں سوم اور ضلع بھر میں اوّل تھا۔ فارسی اردو میں صوبہ میں دوم رہا۔ اس خوشی میں اسکول میں چھٹی ہو گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھے گلے لگا لیا۔ استادوں نے مبارکباد دی۔ مگر وہ جن کی بدولت مجھے یہ درجہ حاصل ہوا تھا خاموش کھڑے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ماسٹر جی کے قدم لئے۔ انہوں نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور جوشِ مسرت میں ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

میں پہلے ماسٹر جی کے گھر گیا۔ ماسٹرانی جی نے پیار سے مجھے مٹھائی کھلائی اور میرا سر چوم لیا۔ سرستی بھی اوٹ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ گھر آیا تو لوگ باگ میرے انتظار میں تھے۔ اور باپ لڈّو تقسیم کر رہا تھا۔ ماں لکھتی کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی اور چھاتی سے لگا لیا۔ لکھتی مجھ سے چمٹ گیا۔ لاجونتی نے ایک روپیہ سر وارنا کیا۔ گھر میں خوب چہل پہل رہی۔ دوسرے دن ماں نے باپ کو طنزاً کہا "یار کو بھول گئے کیا؟ اسے بدھائی کی چٹھی تو لکھ دی ہوتی"۔

باپ نے کہا "خالی چٹھی یا مٹھائی بھی؟"

ماں نے کہا "مٹھائی وہ نہ کھائے گا تو کون کھائے گا۔ مولوی صاحب کا بھی حق ہے، انہیں بھی لکھ دینا۔"

باپ نے دس روپے ان کے نام مشترکہ بھیج دئے اور میرے نتیجے سے انہیں آگاہ کر دیا۔ انہوں نے مشترکہ خط میں روپوں کی رسید بھیج دی اور ہم کو نیک دعاؤں سے مالا مال کر دیا۔ باپ ماسٹر جی کے پاس شکریہ ادا کرنے کے لئے گیا اور الٹا پانچ روپے لے آیا

ایک مقامی بنک نے ۷۵ روپے ماہوار کی نوکری مجھے پیش کی تھی۔ ماسٹر جی کے مشورہ پر ہم نے انکار کر دیا اور ایک مقامی کالج میں داخل ہو گیا۔

اب میرے لئے پے در پے رشتے آنے لگے۔ ماں کہہ دیتی کہ "لڑکا نہیں مانتا۔ ابھی اسے چودھویں تک جانا ہے"۔ باپ کہہ دیتا کہ "برسرِ روزگار ہوئے تو دیکھا جائے گا"۔ لوگ کہتے "کمینے ہیں، ان کا دماغ چل گیا ہے۔ بیٹھنے کو ٹھکانا بھی نہیں اب مال مانگتے ہیں۔ لڑکی کیا پسند آئے گی"۔ اور ہمارے ناموں کی گردان شروع کر دیتے۔ دوسرے تو ہمت ہار بیٹھے مگر لاجونتی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اٹھتے بیٹھتے یہی چرچا رہتا۔ ماموں نے بھی تاکیداً لکھا کہ "رشتہ داروں میں تعلق کا ہو جانا باہر جانے سے بدرجہا بہتر ہوا کرتا ہے۔ دیکھے بھالے لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو آسانی سے مٹ جاتا ہے قباحت کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر غیروں میں جھگڑے کا احتمال ہر وقت قائم رہتا ہے۔" ممانی نے بھی ماں کو لکھا کہ "میری نند اور میری بہن کے گھرانے اکٹھے ہو جائیں تو اس سے بہتر اور کیا ہو گا؟ دو اچھے خاندانوں کا ملاپ بڑے خوشگوار نتائج کا حامل ہوا کرتا ہے۔ لڑکی کا باپ خاصا امیر ہے

لڑکی چار بھائیوں کی اکیلی بہن ہے ۔ ماں باپ کی اکیلی بیٹی ہے وہ جہیز دل کھول کر دیں گے ۔ کوئی کمی نہ رہے گی ۔ گھر بھر جائے گا ۔ لڑکی چتر سیانی (دانا) اور روپ ونتی (خوبصورت) ہے ۔ یہ موقعہ ہاتھ سے گنوانا مناسب نہ ہوگا" اگر حالات مختلف ہوتے تو ماں ، بھائی بھاوج کے کہنے پر بھول چڑھا دیتی ۔ مگر یہاں تو بات پکّی ہو چکی تھی ۔ اس کے علاوہ ماسٹر جی سے خوش آیند امیدیں بھی وابستہ تھیں ۔ ماں نے گول گول کہہ دیا کہ "نکّو کو چودھویں درجے تک جانا ہے ۔ اس میں اور چار سال لگ جائیں گے ۔ اور یہ چار سال کس نے دیکھے ؟ میں تمہارے کہنے سے باہر تھوڑے ہوں ۔ بہن لاجونتی کا ہمیں آسرا ہے ، وہ نکّو کو بہت پیار کرتی ہے ۔ پاس ہونے کی خوشی میں وارنا کیا تھا ۔ ہم اسے ناراض کیسے کر سکتے ہیں" ممانی نے یہ خط لاجونتی کو بھیج دیا ۔ اس نے اسے نیم نہیں پوری "رضا" سمجھ لیا اور مزید تقویت اور دباؤ کے لیئے اپنی لڑکی کو بلا بھیجا ۔ وہ بڑے ٹھاٹھ سے وارد ہوئی ۔ خادمہ ساتھ لائی گہنوں سے لدی اور ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھی ۔ آتے ہی بچھڑی سہیلیوں کی طرح ماں سے لپٹ گئی ۔ دوران قیام میں وہ ماں کے پاس ہی سمٹی رہتی ۔ اپنے گہنوں کی تفصیل و تشریح ، کاروبار کی چہل پہل ، اور نوکروں کی بدمعاملگیوں کے قصے سناتی رہتی ۔ ماں بیچاری ہاں میں ہاں ملاتی ۔ وہ دس پندرہ دن کے بعد چلی گئی ۔ مگر منگنی سے متعلق کھل کر کوئی بات نہ کی ۔ اشارۃً صرف یہ کہا کہ "رانی کی منگنی کر دی ہے ۔ لڑکے کی تلاش میں آئی ہوں ۔ مل جائے تو سبکدوش ہو جاؤں ۔ دولت کی پروا نہیں ۔ اچھا لڑکا ہی بے بہا دولت ہوا کرتا ہے ۔

بڑے بڑے حاکموں سے میل ملاپ ہے۔ منہ سے نکلی فوراً پوری ہوتی ہے بہن! تیری نگاہ میں کوئی لڑکا ہو تو بتا دینا۔ تیرے کہنے پر پھول چڑھا دوں گی۔" ماں پہلے تو چپ ہو گئی پھر "ہاں ہوں" کہہ کر پیچھا چھڑایا۔ مگر لاجونتی اور پکی ہو گئی اور شگن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ماں نے باپ سے ذکر کیا تو اس نے کہا "صاف کہہ دو! کب تک ٹالتی رہو گی۔ ایسے وہ مانے گی نہیں"

ماں نے کہا "ڈرتی ہوں! سر کے بال نوچ لے گی"

باپ نے کہا "آخر یہ کڑوا گھونٹ حلق سے اتارنا ہی پڑے گا"

ماں بولی "ابھی تو کچھ نہ کہوں گی، وقت آنے پر بھائی سے کہلوا دوں گی"

لاجونتی کو صبر کہاں۔ لوہڑی کے تہوار پر مجھے مٹھائی اور روپے بھجوا دیئے۔ ماں نے انکار کر دیا۔ پھر کیا تھا، خدا دے اور بندہ لے۔ وہ صلواتیں سنائیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بیسوا، خائنہ، بھاپا گٹنی، پگلی، شرابن، کیا کچھ تھا کہ کہہ نہ سنایا۔ ماں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ باپ آیا۔ کیفیت بیان کی تو وہ بھی خوب گرم ہوا، اور کہا "کسی کے دبیل تھوڑے ہیں۔ اپنا پکاتے اپنا کھاتے ہیں۔ نہیں رشتہ بنتے، ہماری مرضی، دولت کا گھمنڈ ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں دولت نہیں چاہیئے۔ کسی غریب سے رشتہ کریں گے۔"

ایشر داس نے کوئی مداخلت نہ کی بلکہ بیوی کو جھگڑے سے روکا۔ مگر وہ کس کی سنتی تھی؟ کئی دن جھگڑا کرتی رہی۔ باپ نے ماموں کو حالات سے آگاہ کر دیا۔ اور لاجونتی سے متعلق ناراضی کا اظہار کیا۔ جواب آیا کہ لاجونتی منہ زور ہے اسے خاطر میں نہ لاؤ، جہاں مناسب سمجھو رشتہ کر دو، ہمیں کوئی اعتراض نہ

ہو گا" روز روز کے جھگڑے سے تنگ آکر باپ نے دوسری جگہ مکان تلاش
کرنا شروع کر دیا۔

شیکسپیئر نے (*Rape of Lucrece*) کے عنوان سے "وقت"
پر ایک طویل نظم کہی ہے۔ جس کے ایک بند کا ترجمہ یہ ہے :-

"خشمناک بادشاہوں کو ٹھنڈا کرنا وقت کا کرشمہ ہے۔ جھوٹ کا پردہ
فاش کرنا اور سچائی کو اجاگر کرنا، پارینہ اشیاء پر زمانے کی چھاپ لگانا،
صبح کو بیدار کرنا، رات کی پاسبانی کرنا، غلط کاروں کو سزا دینا تاکہ وہ راہِ راست
پر آجائیں۔ وقت کے ہتھوڑے سے عالیشان عمارتوں کو مسمار کرنا اور ان کے
چمکیلے کلسوں کو مٹی میں ملا دینا، مٹانے اور مسمار کرنے کے عمل سے گمنامی کو
تقویت دینا، پرانی کتابوں کو قلمزد کرنا، اور ان کے مضامین میں ترمیم کرنا۔
کہن سال پہاڑی کوے کے پروں کو قلم کے لئے نوچ لینا، پرانے شاہ بلوط کا
رس نچوڑ لینا اور نئی کونپلوں کی پرورش کرنا، قسمت کے چکر کو دوسری طرف موڑ
دینا، بڑھیا کو اپنی بیٹیوں کی بیٹیوں سے روشناس کرنا، بچے کو آدمی اور بوڑھے
کو بچہ بنانا۔"

اب میں ۲۲ برس کا ہو گیا تھا اور نکھی ۱۵ کا۔ وہ دسویں میں تھا اور میں
بی اے آنرز ہو چکا تھا۔ ماں باپ پچاس برس کے ہو گئے تھے۔ گاؤں کی تباہی،
غریب الوطنی، کثرتِ کار اور تفکراتِ زمانہ نے انہیں نحیف و نزار بنا دیا تھا۔
ہم بچے سے جوان بن رہے تھے اور وہ تخریبِ اشیاء کے عمل سے گمنامی کی
طرف گامزن تھے۔ ہمارے قدم مستحکم ہو رہے تھے، ان کے پیر اکھڑ رہے

تھے۔ وہ پارینہ اشیاء تھے جن پر زمانے کی مُہر ثبت ہو رہی تھی۔ ہم ایک نئی عمارت تھے جس کی تعمیر ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ وہ پرانا محل تھے جسے وقت کا ہتھوڑا مسمار کئے جا رہا تھا۔ وہ ہماری اٹھان پر خوش تھے اور ہم ان کے زوال سے لاپروا۔ وہ ہماری فلاح و بہبود میں کوشاں تھے اور ہم ان سے متعلق بے نیاز۔ ان کے اعضاء ڈھیلے ہونے جا رہے تھے، چہروں پر جُھریاں آرہی تھیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھک کر چُور ہو چکے ہیں۔ پھر بھی وہ زندگی کی جدوجہد میں مصروفِ کار تھے تاکہ ان کی اولاد سربلند و ممتاز ہو سکے۔

بی اے کے بعد ماسٹر جی کی وساطت سے مجھے ایک مقامی اسکول میں مدرسی کی عارضی ملازمت مل گئی اور میں بھی "ماسٹر جی" بن گیا۔ ماسٹر جی نے شگن دے دیا اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اور باپ کو بلا کر تاکیداً کہا "دیکھنا! پنڈت وشنپت رائے جی! لبساط کے مطابق چھلانگ لگانا۔ کہیں کمر نہ توڑ بیٹھنا"

زندگی میں پہلی بار باپ کو اتنی توقیر سے مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ حیران رہ گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ آیا۔

ماسٹر جی کی لڑکی، میری منگیتر دسویں کے بعد سلائی کے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ ہم نے نقلِ مکان کر لیا تھا اور اپنے زرخرید مکان میں آگئے تھے جس کی رجسٹری میرے اصرار پر باپ نے نکھی کے نام کرا دی تھی۔ اب باپ کے پاس چار ٹھیلے ہو گئے تھے جن پر ملازم رکھے ہوئے تھے۔ آپ شاذ ہی کام کرتا۔ زیادہ نگرانی ہی تھی۔ امرتسر پھیل رہا تھا۔ جائداد

کے مول تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ نئی بستیاں آباد ہو رہی تھیں۔ تجارت کے ساتھ صنعت بھی فروغ پا رہی تھی۔ ٹانگے کی جگہ موٹر نے لے لی تھی۔ "دنیا بھر کے مزدورو! متحد ہو جاؤ" کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ آزادیٔ وطن کی جدوجہد جاری تھی اور میرا باپ "ٹھیلہ یونین" کا صدر تھا جو ٹھیلے والوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھی۔

لاجونتی خاموش نہ تھی اس نے منگنی فسخ کرانے کے لئے سو پاپڑ بیلے۔ گمنام چٹھیاں بھیجیں۔ ہمارے اخلاق پر رکیک حملے کئے، ہماری مجلسی حالت اور معاش کا مضحکہ اڑایا۔ ٹھیلوں کی تضحیک کی، اپنے دو بیٹے کا رشتہ دے کر گئی۔ مگر ماسٹر جی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر میری شادی ہو گئی۔ برات کے استقبال اور تواضع کے لئے برگزیدہ منتخب شہری آئے ہوئے تھے۔ مگر برات مشتمل تھی میرے ماموں، چچا جیتا، میرے چند دوستوں، لکھّی، اور ٹھیلے والوں پر۔ برات دیکھ کر ماسٹر جی کے متعلقین بہت مایوس ہوئے۔ بری بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ممانی کے تقاضے کے باوجود ماں نے ہار بری میں نہ رکھا اور نہ خود پہنا۔ مگر ماسٹر جی کسی کو خاطر میں نہ لائے اور کہا بھی تو صرف یہ کہ "میں نے تو لڑکا ہی دیکھا ہے، اس میں نقص بتاؤ"

رسوم کی ادائی کے بعد ہم لوگ فرحاں و خنداں ڈولی لے کر گھر آ گئے۔ جہیز اتنا تھا کہ ہمارے گھر میں سما نہ سکتا تھا۔ بہت سا سامان بطور امانت وہیں چھوڑ آئے۔ ماسٹر جی نے بصد انکسار ہمیں وداع کہی باپ نے جیتا سے تعارف کرایا تو بغلگیر ہو کر ملے۔ اور دو روپے نذرانہ

پیش کیا۔ بیوی آئی تو ماں بڑے لاڈ پیار سے پیش آئی اور دادی کا عطیہ ۳۵۰ روپے اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ جو اس نے ماں کی تحویل میں دے دیا۔ چند دن کے بعد حسینا چلا گیا۔ ماں نے دل کھول کر اسے نیگ جوگ دیا۔ اس نے بھی بیوی کو سلامی کے ۵ روپے عنایت کئے۔ اور ہمیں نیک دعاؤں سے تونگر و خوشحال کر دیا۔ اب ہمارے گھر میں سرستی کا اضافہ ہو گیا تھا اور ہمارا گھرانا ضدین" دولت + علم" کا معجونِ مرکب بن گیا تھا۔

ماسٹر جی کے بلاوے پر ہم چند دن ان کے ہاں رہے۔ وہ بڑے پیار سے پیش آئے اور ہیری بڑی پذیرائی کی۔ ساس نے دورانِ گفتگو میں بتایا کہ برات کی رات بھی لاجونتی شرارت سے باز نہ آئی متعلقین کو برانگیختہ کرتی رہی یہاں تک کہ چند رشتہ دار اٹھ کر چلے گئے۔ مگر ہم نے کوئی پروانہ کی۔

لکھتی چند دنوں ہی میں بیوی کا دُلارا بن گیا۔ باپ پرے پرے رہتا۔ ماں آنکھوں سے پل بھر بھی اوجھل نہ ہونے دیتی۔ مگر میری کیفیت یہ تھی کہ سہما رہتا۔ یہ نہیں کہ اس کی شکل ڈراونی تھی یا اس کا رویہ گستاخانہ تھا، یا وہ بانونی اور جھگڑالو تھی یا اس کے اطوار ناپسندیدہ تھے۔ بلکہ وہ ہر پہلو سے قابلِ توصیف تھی۔ وہ ماں کی حضوری میں رہتی، اس کے اشارے پر چلتی۔ باپ کی تعظیم کرتی لکھتی کو پیار دلاسے سے رکھتی اور میری خدمت میں مستعد رہتی۔ خندہ پیشانی سے پیش آتی۔ بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے مگر ——— میں اس سے مانوس نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ میرا احساسِ کہتری تھا جو انتہائی کوشش کے باوجود میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں اپنے ذہن سے یہ بات نہ نکال سکا کہ

میں ایک حقیر ٹھیلے والے کا لڑکا ہوں اور وہ ایک معزز سیکنڈ ماسٹر کی لاڈلی لڑکی میں آپ سے آپ اس سے پرے پرے رہتا۔ جتنا وہ آگے بڑھتی، اتنا ہی پیچھے ہٹ جاتا۔ میں ایک معمہ بن گیا تھا۔ نہ صرف اس کے بلکہ اپنے لئے بھی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر عمل سے اس نے مجھے اپنی طرف کھینچنے کی انتہائی کوشش کی، مگر بے سود۔ آخر وہ مناسب موقعہ کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ اور میرے اور اس کے درمیان فاصلہ روز بروز بڑھتا گیا۔ بدقسمتی نہیں بلکہ خوش قسمتی سمجھئے کہ گرما کی تعطیلات میں بہن لکشمی کو ماموں کے ہاں چھوڑ آیا تو لُہلا کر بخار چڑھ گیا۔ پہلے تو معمولی دوادارو ہوتا رہا مگر بعد کو الجھنیں بڑھ گئیں۔ اور میری حالت خراب ہوتی گئی۔ ماسٹر جی کے مشورے سے باپ ایک نامور ڈاکٹر کو لے آیا۔ ان ایّام میں بیوی ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ سے جدا نہ ہوئی۔ اور میری دلداری میں کوئی دقیقہ اس نے اٹھا نہ رکھا۔ اگرچہ زندگی وبالِ جان ہو گئی تھی اور سانس تک لینا کٹھن ہو گیا تھا۔ مگر میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کے لئے نہیں، لکشمی کے لئے نہیں، اپنے آپ کے لئے بھی نہیں بلکہ سَرستی کے لئے جو میری منکوحہ بیوی تھی۔ میں ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ وہ آنکھیں اٹھاتی کنکھیوں سے میری طرف دیکھتی۔ اس کی غم دیدہ آنکھوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور شرما کر آنکھیں پھیر لیتی۔

میری حالت نازک ہو گئی تو ڈاکٹر نے اسے انگریزی میں کہا "مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے آج کی رات بھاری ہے۔ چوکنے رہنا۔ اور ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا"۔

وہ حزن و ملال کی تصویر بنے کھڑی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ ماں نے پوچھا تو تسلی آمیز لہجہ میں کہا "خیر سلا ہے، فکر کی بات نہیں ٹھیک ہو جائیں گے۔" ماں مطمئن ہو کر سو گئی۔ باپ کو بھی ٹال دیا۔ وہ عروسی جوڑا پہن کر میرے سرہانے آ بیٹھی۔ میں نے حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے خشک لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ میرے جسم میں بجلی کی سی ایک لہر دوڑ گئی جس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نمناک آنکھوں سے اسے بغور دیکھا اور رقت آمیز الفاظ میں کہا "افسوس! تمہیں چھوڑے جا رہا ہوں" یہ کہہ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے اطمینان و دلجمعی سے جواب دیا "نہیں میں تمہیں جانے نہ دوں گی۔ اگر کوئی چارہ نہ رہا تو یقین جانو تم اکیلے نہ جاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی" یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی ہم دونوں یک دل اور یک جان ہو کر دیر تک روتے رہے۔ جب جی ہلکا ہو گیا تو اس نے گیلے تولیے سے میرے ہاتھ منہ پنڈلیاں اور پاؤں دھو کر پونچھ کر دیئے اور میرے پاؤں دابنا شروع کر دیئے۔ مجھے نیند آ گئی۔ وہ رات بھر سر بسجود رہی۔ ایک لمحے کے لئے بھی جھپکی نہ لی۔ اور میں رات بھر سویا کیا۔ غافل اور مدہوش۔ جب آنکھ کھلی تو دن چڑھا ہوا تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ اس نے گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ دیکھا تو بخار اتر چکا تھا۔ اس نے ضبط سے کام لیا۔ اور مجھے لٹا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے پھر نیند آ گئی۔ ڈاکٹر آیا تو بیوی نے سارا حال کہہ سنایا۔ وہ بہت خوش ہوا اور "پھر آؤں گا" کہہ کر چلا

گیا۔ دوسری بار آیا تو میں سرہانے کے سہارے بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے خون کے دباؤ، نبض کی ضربوں اور دل کی دھڑکنوں کا بغور معائنہ کیا۔ انتڑیوں کو دیکھا بھالا اور جاتے جاتے بیوی کو کہہ گیا "تمہیں مبارک ہو، تمہارا خاوند بچ گیا۔ یہ خدا کے گھر سے پھرنا ہے۔ معجزے سے کم نہیں۔ اسے پرہیزی کھانا دیتے رہنا۔ دوا بدل دی گئی ہے۔ تھکاوٹ سے بچائے رکھنا" بیوی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا ہاتھ جوڑ دیے۔ میری طرف دیکھا اور بے اختیار دو چار آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

چند دنوں میں مَیں اچھا ہو گیا۔ اب بھی سوچتا ہوں کہ یہ میری قوتِ ارادی تھی، دوا دارو کی تاثیر تھی، دعاؤں کا اثر تھا یا بیوی کا عزمِ راسخ، پیار اور دلسوزی کہ میری جان بچ گئی۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے اتنے نزدیک ہو گئے کہ "من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی"[۱] کی کیفیت ہم پر صادق آ گئی۔ غسلِ صحت کی خوشی میں ماسٹر جی نے مجھے اور میری بیوی کو دعوتِ طعام دی۔ بیوی اہتمام اور شان سے جانا چاہتی تھی۔ سلائی کی ماہر تو تھی ہی۔ اس نے اپنے لئے ایک نئی وضع کا بلاؤز[۲] سی لیا۔ ساڑھی پر بڑی پیچیدہ اور دلکش مینا کاری کر لی۔ اور نئی قسم کی جھالر لگا لی۔ کپڑوں میں رنگوں کے تقابل اور جوڑ توڑ سے ایک نئی اور نرالی کیفیت پیدا کر لی۔ نیا جوتا پہن لیا۔ زیورات کے انتخاب میں بھی کپڑوں اور جوتے کی مطابقت و موافقت

---

۱ ترجمہ: "میں تو ہُوا تو میں ہُوا، میں جاں ہُوا تو تن ہُوا" ۲ Blouse

کا خیال رکھا اور صابن سے انہیں صاف کر لیا۔ مگر ماں کے ہار کے بغیر سنگار پورا نہ ہوتا تھا۔ ماں سے ہار کا لینا محال تھا اور مانگنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔ آخر جھجکتے جھجکتے اس نے مانگ ہی لیا۔ حسب معمول ہار کا نام سنتے ہی ماں کا رنگ اڑ گیا۔ اور سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر گھبرا کر کہا "لے جانا بیٹی! یہ تیرا ہی دھن ہے"۔ اور شاید سوچ کر کہ دھن تو پرایا ہے وہ خاموش ہو گئی۔ تذبذب کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ توقف کے بعد پھر بولی" اس گہنے کو بد دعا ہے، گھر سے باہر پہننے کی مناہی ہے۔ لے جانا، بٹوے میں ڈال لینا میکے جا کر پہن لینا۔ احتیاط سے رکھنا بیٹی! بازار یا گلی میں پہن کر نہ جانا۔"

بیوی نے وعدہ کر لیا اور ماں نے بادلِ ناخواستہ ہار دے دیا مگر پھر بھی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ ہار خاصا بھاری تھا۔ گلوبند کی مخمل بہت میلی ہو گئی تھی۔ بیوی نے مخمل بدلی، ہار صابن سے دھویا۔ مخمل کے نیچے ہار پر انگریزی میں "سیٹھ جوہری مل نگین چند" کندہ تھا۔ بیوی نے سمجھا کہ صراف کا نام ہو گا۔ صفائی اور مخمل کی نئی تراش نے ہار کو بالکل ایک علیحدہ چیز بنا دیا تھا۔ بیوی نے ہار ماں کے گلے میں ڈال دیا۔ آئینہ دکھایا تو ماں نے استعجاب سے کہا" بیٹی! کیا یہ وہی ہار ہے؟ تو نے تو اسے کچھ اور ہی بنا دیا" اور اس تبدیلی سے قدرے مطمئن ہو بیٹھی کہ شناخت آسان نہ رہی

دوسرے دن ہم سسرال چلے گئے۔ لکھتی واپس آ گیا تھا۔ بیوی اسے بھی ساتھ لے گئی۔ بیوی نے گھر میں قدم رکھتے ہی ہار پہن لیا۔ ماسٹر جی نے اپنے دوستوں اور ان کے بال بچوں کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ ہماری بڑی مان دان کی۔ سب

نے تعلقات کی بنا، پروا نا کیا۔ ہار کی سب نے تعریف کی اور کہا "ہزاروں کا ہو گا، ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔" اور ہماری امارت کے چرچے ہونے لگے۔ للّکی سے متعلق بھی سرگوشیاں ہوتی رہیں کہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس کی تعلیم سے متعلق پوچھتی رہیں۔ واپس آئے تو بیوی نے ہار ماں کے حوالے کر دیا۔ وہ فکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہار پا کر اس کی جان میں جان آئی۔ اشتیاق سے پوچھا کہ "ہار کے بارے میں عورتیں کیا کہتی تھیں؟" بیوی نے کہا بہت تعریف کرتی تھیں۔ کہتی تھیں بہت قیمتی ہار ہے، ہزاروں کا ہوگا" ماں نے حیران ہو کر کہا "ہزاروں کا؟" پھر سنبھل گئی اور آنکھیں بند کر کے آہستہ سے کہا "ہیرا ہی تو ہے" اور خود فریبی اور غلط بیانی پر جھینپ گئی۔ کہتے ہیں بد دیانتی کا جذبہ دل میں نہ ہو تو ہاتھ نہیں کانپتے۔ ماں کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور جواہرات جھلا جھلا کر اس کی باطل خیال آرائی پر خندہ زن تھے!

اس نے کہا "میرے پیارے! زندگی کے تین برس اور بیت گئے میری بھرپور جوانی تھی۔ ایم اے ہو چکا تھا اور کالج میں پروفیسر تھا مزید ترقی کی راہیں سامنے کھلی تھیں۔ ذہن رسا تھا اور قوئے مضبوط۔ دو خوبصورت بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ میرا بھائی اب اٹھارہ سال کا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ ایف اے میں تھا۔ اور کرکٹ میں اس نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قدرتی لچک تھی، ایسی کہ گیند کو جس طرف چاہتا دائیں بائیں گھما لیتا تھا۔ وہ اس فن کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے سامنے اچھے اچھے کھلاڑیوں کے چھکّے چھوٹ جاتے تھے کھیلنے میں بھی وہ بہت ہوشیار تھا۔ اکثر انعام و اکرام حاصل کرتا رہتا۔ اپنے کالج کا محبوب تھا۔ اور مخالفوں کے لئے مکمل دہشت۔ ماں اور باپ اب ۵۳ سال میں تھے اور زیادہ نحیف ہو گئے تھے۔ ماں نے گھر کا

کام کاج بیوی کے سپرد کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ہار بھی دے دیا تھا۔
اس کی دلچسپیاں صرف بچوں تک محدود تھیں یا والد کی دیکھ بھال تھی
روزگار کا روشن رخ ہماری جانب تھا اور ہم اپنی زندگی آرام و عافیت
سے گذار رہے تھے کہ دفعتہً وقت نے اپنا رُخ دوسری طرف موڑ لیا۔ میرا
پلوٹھی کا لڑکا چند دن بیمار رہ کر چل بسا۔ اس صدمے نے ماں کو بدحال
کر دیا۔ اور ہمارے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا۔ لڑکا ہونہار تھا۔ گھر والے تو خیر، غیر بھی
اسے پیار کرتے تھے۔ ہر چند ہمیں معلوم تھا کہ آنسو آبِ حیات کے قطرے
نہیں ہیں کہ مردے کو زندہ کر سکیں۔ ہم میں سے ہر ایک رونے دھونے میں
ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں تھا۔ ساس تو اسے
گود لینے کے خیال میں تھی۔ اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ابھی یہ زخم مندمل
نہ ہوا تھا کہ باپ ایک فرعون مزاج رئیس کے ٹانگے تلے آکر کچلا گیا۔ راہ گیروں
نے ٹانگہ کوتوالی پہنچا دیا اور باپ کو ہسپتال لے گئے۔ اس کی ٹانگیں کچلی گئی
تھیں اور پسلیاں چُور ہو گئی تھیں۔ وہ کئی گھنٹے بے ہوش رہا۔ ہمیں پتا لگا تو
ماسٹر جی کو لے کر ہسپتال پہنچے۔ پولس والوں کی موجودگی میں مجسٹریٹ نزعی
بیان لے رہا تھا۔ تھانیدار نے مخاطب کر کے کہا "اس پوربئے نے (جس کے
ہتھکڑی لگی ہوئی ہے جُرم کا اقبال ان لفظوں میں کیا ہے کہ گھوڑے کی راسیں
اس کے ہاتھ میں تھیں، اور تم گھنٹی اور للکارنے کے باوجود نہ ہٹے تھے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ تم کچلے گئے۔ تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی۔ قسمت کا کھیل! کیا
تم تصدیق کرتے ہو کہ یہ ٹھیک ہے؟"

پورببہ ہاتھ جوڑے کھڑا رو رہا تھا معصومیت اور کرب کا ملا جلا تاثر اس کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔ باپ نے بات کو پالیا کہ ساہوکار کو پولس نے چھوڑ دیا ہے اور پوربئے کو دے دلا ڈرا دھمکا کر قربانی کا بکرا بنالیا ہے۔ باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ایک دردناک ہوک اس کے دل سے اٹھی۔

"پوربیا بے گناہ ہے اسے چھوڑ دو!" یہ کہہ کر میرے باپ نے آنکھیں بند کر لیں اور دائمی نیند سو گیا۔ ہم نے احتجاج کیا مگر مجسٹریٹ نے ضابطہ پورا کرنے کے بعد پوربئے کو چھوڑ دیا۔ تھانیدار اور مجسٹریٹ اپنی کارگذاری سے مطمئن ہنستے کھیلتے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ہم قسمت کے مارے وہیں بیٹھے رہے۔ ٹھیلا یونین نے ہڑتال کر دی۔ ماسٹر جی ڈپٹی کمشنر سے ملے ہیں نے محضرنامہ پیش کیا۔ اخباروں میں واویلا مچایا مگر شنوائی نہ ہوئی۔ بھلا ٹھیلے والوں کی کون سنتا؟ اور میں بھی آخر کیا تھا۔ ایک ٹھیلے والے کا لڑکا! دریں اثنا پوربئے کو کسی محفوظ جگہ بھجوا دیا گیا تاکہ تردیدی بیان حاصل نہ کیا جا سکے۔ باپ کا انتقال بڑا بھاری صدمہ تھا۔ ماں نے تو کھانا پینا بند کر دیا۔ ماموں ممانی کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ چاچا حسینا نے پیٹ پیٹ کر چھاتی نیلی کر لی۔ اس کے دلسوز بین سُنے نہ جاتے تھے۔ لکھتی کا برا حال تھا۔ بیوی نڈھال تھی۔ ماسٹر جی ہمارے غم میں شریک رہے اور ہمیں حوصلہ دیتے رہے۔ مگر پھر بھی ہمارے گھر میں عرصہ تک ماتم چھایا رہا۔ ہمارا باپ لاثانی آدمی تھا۔ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بلند تھا۔ اس نے خاندان کو چاہ مذلت سے نکال کر ممتاز و بلند کر دیا اور قدر و منزلت جو ہمیں نصیب ہوئی، اسی کی محنت

و ایثار کی بدولت تھی ۔ ہر چند اس کا رویّہ ہار سے متعلق پسندیدہ نہ تھا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا ؟ ہار کا کوئی دعویدار نہ تھا کہاں پھینک دیتا اور پھر مال ...... !

لکھی ۲۲ برس کا ہو چکا تھا ۔ اور اس نے بی اے کر لیا تھا ۔ ماں دائم المرض تھی ۔ چاہتی تھی کہ اس کی شادی ہو جائے ۔ کئی رشتے آئے ۔ ماں اور بیوی نے ماسٹر جی کے متعلقین میں سے ایک لڑکی پسند کر لی ۔ ابھی بات چیت چل رہی تھی کہ ایک ایسا ناگہانی اور غیر متوقع سانحہ پیش آیا ۔ جس نے ہمارے گھر کی بنیادوں تک کو ہلا دیا ۔

پردیس کی ایک نامور کرکٹ ٹیم ہندوستان کے دورے پر تھی ۔ امرتسر الیگزنڈرا گراؤنڈ[1] میں سہ روزہ میچ کھیلا جانا تھا ۔ اس معرکہ خیز مقابلے کے لئے لکھی کو بطور بولر[2] لیا گیا تھا ۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا ۔ جس کی قیمت درجہ بدرجہ ۱۰۰ روپے ۵۰ روپے ۱۰ روپے اور عوام کے لئے ۳ روپیہ تھی ۔ راجے مہاراجے ، رؤسا امرا ، حتےٰ کہ گورنر بہادر تک تشریف لائے ہوئے تھے ۔ خوب چہل پہل اور رونق تھی ۔ لکھی اپنی سفید پتلون ، ریشمی قمیص ، سفید بوٹ اور کھلاڑیوں والی ٹوپی میں خوب جچتا پھبتا تھا ۔ اس کی قمیص پر اس کی کلب کا نشان اس کی شخصیت کو اور نمایاں کر رہا تھا ۔ ہندوستانی ٹیم نے ٹاس[3] جیتنے کے بعد کھیلنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اور پہلے دو کھلاڑی جو میدان میں آئے ان میں ایک لکھی تھا ۔ یہ نظارہ قابلِ دید تھا

---

[1] Alexandra Ground [2] Bowler [3] Toss

لکھتی پیڈ[1] باندھے، بیٹ[2] تھامے گلو[3] گھماتا مستانہ چال سے اپنے کیمپ[4] سے نکلا۔ تالیوں کی جھنکار سے آسمان گونج اٹھا۔ اور تمام نگاہیں اس پر مرکوز ہوگئیں۔ لوگ اس سے بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ امپائر[5] آگئے اور کھیل شروع ہوگیا۔ لکھتی نے چھوٹتے ہی چھکا لگایا اور گیند کو بونڈری[6] کے باہر پھینک دیا۔ تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے۔ اور ساتھ ہی سٹیڈی سٹیڈی (Steady) کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ لکھتی اکیلا ہی کھیل کو خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوا تھا۔ دوسرے کھلاڑی کو کھیلنے کا موقعہ کم دیتا۔ پردیسی ٹیم نے کئی بولر پے در پے بدلے مگر ان سے کچھ بن نہ آیا اور لکھتی کھیل پر چھایا رہا۔ آخر ۳۷ دوڑیں بنانے کے بعد لکھتی کیچ آؤٹ[7] ہوگیا۔ میدان اکھڑ گیا اور لوگ اسے کندھوں پر اٹھا کر کیمپ میں لے آئے۔ کھیل سارا دن جاری رہا اور ہندوستانی ٹیم ۲۱۳ دوڑیں بنا کر آؤٹ ہوگئی۔ کھیل دو دن اور جاری رہنا تھا۔ منتظمان نے پچ[8] کی رکھوالی کے لئے چوکیدار متعین کر دئے دوسرے دن لکھتی کی پوشاک تو وہی تھی مگر بوٹ بغیر ایڑی کے تھا۔ جب پردیسی کھلاڑیوں کا جوڑا اندر آگیا تو ہندوستانی ٹیم کے کپتان نے مسکراتے ہوئے نیا گیند لکھتی کے ہاتھ میں دے دیا اور آپ سلپ[9] کی فیلڈ[10] پر کھڑا ہوگیا۔

---

1 Pad 2 Bat 3 Glove 4 Camp 5 Umpire
6 Boundry 7 Catch out 8 Pitch 9 Slip
10 Field

لکھتی نے مناسب جگہوں پر فیلڈر کھڑے کر دئے اور گیند اس کمال کے دئے
کہ پہلے اوور¹ میں مخالف کوئی دوڑ نہ لگا سکے۔ جب دوسرا اوور شروع ہُوا
تو پردیسی کپتان نے پچ کو بغور دیکھا، میٹنگ² کو پھر سے لگوایا۔ اس اوور
میں کھلاڑیوں نے ۷ دوڑیں لگالیں۔ اور کھیل میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لکھتی
کا اوور آیا تو گراؤنڈ میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ اور لوگوں نے تالیاں بجانا
شروع کر دیں۔ لکھتی نے کلائی کے وہ جوہر دکھائے کہ لوگ اش اش کر اٹھے
اور مخالف ٹیم میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور لکھتی نے پے در پے تین کھلاڑی
آؤٹ کر دئے۔ گراؤنڈ میں تہلکہ مچ گیا۔ گورنر بہادر نے بھی تالی بجا کر لکھتی
کی عزّت افزائی کی۔ اور کرکٹ کے آئین و دستور کے مطابق مخالف ٹیم کے
کپتان نے اس ہیٹ ٹرک³ کے لئے لکھتی کے سر پر اپنی ٹوپی رکھدی۔
کھلاڑی اب کھیل نہیں رہے تھے بلکہ وقت ٹال رہے تھے۔ لکھتی کے
گیند کو چھونے سے بھی ڈرتے اور یونہی چھوڑ دیتے۔ ہاں دوسرے باولروں
پر وہ قادر تھے۔ کھیل ختم ہُوا تو وہ ۱۹۹ دوڑیں بنا چکے تھے۔ تیسرا دن اب
کھیل کا آخری دن تھا۔ اور ہندوستانی ٹیم کو کھیلنا تھا۔ کھلاڑی کھل کر کھیلے
اور ۳۰۰ سے اوپر دوڑیں بنالیں۔ کھیل ہار جیت کے بغیر ختم ہوگیا۔ کھیل
کے اختتام پر دونوں ٹیمیں گورنر بہادر کے پیش کی گئیں۔ انہوں نے کھلاڑیوں
سے مصافحہ کیا۔ انعام دیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے لکھتی

---

¹ Over ² Matting ³ Hat Trick

کو گھیرے میں لے لیا اور اس کا نام لے کر تالی بجانا شروع کر دی اور انعام واکرام دینے شروع کر دئے۔ ایک مہاراجہ نے سو روپے کا نوٹ دیا۔ اور دو صد روپے کی نوکری بھی پیش کی۔ اس کے نزدیک ہی ایک حسینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی مصافحہ کیا اور مسکرا کر دس روپے کا نوٹ للّتی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ . . . . سرد آہ بھر کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔

سقراط نے حسن کو "قلیل العمر ظلم" کہا ہے۔ افلاطون نے "قدرت کا کرشمہ" ارسطو نے "سب سے بڑی سفارش" تھیو ماسٹس نے "گونگا فریب"۔ تھیوکری ٹس نے "خوشگوار تعصب"۔ ہومر نے "قدرت کی عظیم بخشش" اووڈ نے "دیوتاؤں کا کرم"۔ شیکسپیر نے "زر وجواہر سے زیادہ پرکشش چیز" نیاز فتحپوری نے "سکوتِ استغناء"۔ اور لارڈ بائرن کا تاثر یہ ہے کہ

Her overpowering presence made you feel
It would not be idolatory to kneel

جب اس کے سامنے جاؤ گے خود محسوس کر لو گے
سر اس کے پاؤں پہ رکھ دینا کفر اس کو نہیں کہتے

یعنی اس کی شانِ حضوری تمہیں احساس دلا دے گی کہ اس کے حضور میں دو زانو ہو جانا بت پرستی (کفر) نہیں ہے۔

میرے بھائی نے اس حسینہ کے حضور گھٹنے ٹیک دئے اور اپنے

ل؎ حسن ہے اک سکوتِ استغنا عشق تکرارِ مدعا کی خلش

دل کے مندر میں اس کی مورتی (تصویر) استھاپن (نصب) کر لی۔ اور مولوی صاحب کے انتباہ کے باوجود وہ "امرتسر کی پھسلنی سرزمین" میں راہ مستقیم سے پھسل گیا۔ وہ ایک پیشہ ور رقاصہ تھی، بازاری بیسوا!

للّھتی کے عشق کا تصور پاکیزہ اور بے داغ تھا۔ بے راہ روی کا شائبہ بھی اس میں شامل نہ تھا۔ اس کی نگاہ میں پنجابی ادب کے سسّی پنوں، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا۔ فارسی ادب کے لیلےٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور انگریزی ادب کے رومیو جیولٹ سمائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی محبوبہ کو اسی نظر سے دیکھتا اور اسی معیار سے جانچتا۔ وہ بار بار ان کے مکالمے پڑھتا اور اپنی محبوبہ کے سامنے پیش کرتا مگر وہ متاثر نہ ہوتی۔ مایوس ہو کر وہ اس ماحول سے بھاگنے کی کوشش کرتا مگر اس کے قدم نہ ہلتے۔ بالآخر اس نے چاہِ مذلت میں چھلانگ لگا دی اور تحت الثرےٰ میں پہنچ گیا۔ اور نفس کی پیروی میں اس نے

"قیمت میں اس کی خرقہ دے تسبیح دے نماز دے"

کا عمل پورا کر دیا اور پھر اُس رسوائی کا سامنا ہوا جو اس گلی میں ناگزیر ہے

والدین (اور خاص طور پر ماں) اپنی اولاد سے متعلق خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ للّھتی کی بے راہ روی کے چرچے ماں تک پہنچے تو اسے یقین نہ آتا۔ وہ اسے لاجونتی کی شرارت سمجھتی اور پرزور تردید کر دیتی۔ بلکہ بُرا مناتی۔ مگر میں چوکنا ہو گیا اور جلد ہی پتا لگ گیا کہ "میرا بھائی" فسق و فجور کی منزلیں طے کر کے اخلاقی رسوائی کی انتہا پر پہنچ چکا ہے۔ میں سیر

کے بہانے اسے باہر لے گیا۔ اور بڑی نہر کے کنارے تنہائی میں بیٹھ کر اسے کہا "میری جان! تم کو قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ انسان خطاؤں کا پتلا ہے۔ بہت ہولی اب قدم موڑلو باپ مر چکا ہے۔ ماں مر رہی ہے۔ میں بھی مر جاؤں گا۔ گھر ویران ہو جائے گا کہیں کے بھی نہ رہیں گے"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے گلے لگا لیا۔ دیدہ بوسی کی اور کہا "اگر بے بس ہو تو شادی کر لو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔ بلکہ خوشی ہوگی کہ تمہاری وساطت سے ایک گمراہ عورت راہِ راست پر آگئی اور تائب ہوگئی"

وہ بولا "اس کے لیے تو مذہب چھوڑنا ہوگا"

میں نے نرمی اور پیار سے کہا "بدکاری گمراہی اور لامذہبی کا مذہب تو ہر حال میں واجب الترک ہی ہے ......"

اس نے بات کاٹ کر کہا "سمجھ لیا، کل بتاؤں گا"۔

اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ تلاش کے باوجود کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں فکرمند تھا، ماں غمزدہ تھی، بیوی اداس، اور گھر غمکدہ بن گیا تھا۔ ماں نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور روتی رہتی۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بھائی سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ کوئی اور کیا کرے گا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ماں کی ممتا بالکل نرالی چیز ہے۔ میں تسلی دیتا کہ ..... کھیلنے گیا ہوگا مگر اس کا دل نہ مانتا اور وہ غمزدہ رہتی۔

چند ماہ کے بعد کچہری کے آدمی ایک مقامی وکیل کے ساتھ ہمارے مکان پر آئے۔ میں گھر پر ہی تھا۔ گلی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ پتا لگا کہ

لکھمی مکان ٹھکانے لگا چکا ہے اور یہ لوگ قبضہ لینے آئے ہیں۔ یہ سُن کر ماں پر غشی طاری ہو گئی۔ ماسٹر جی نے اپنے مکان کا ایک حصّہ عارضی طور پر ہمیں دے دیا اور ہم وہاں اٹھ آئے۔ جو سُنتا لکھمی کو برا کہتا۔ ہمیں یہ بات بھی بُری لگتی۔ "اپنا پیسہ کھوٹا، پرکھنے والے کا کیا دوش" کسی کو کیا کہہ سکتے تھے۔ سُننی پڑتی اور خاموش رہ جاتے۔ بیوی نے زیورات دیکھے تو ہار بھی غائب تھا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا مگر یہ نقصان ماں سے پوشیدہ رکھا۔ یہ ایام ہمارے لئے انتہائی بیقراری کے تھے۔ سب دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اگرچہ اس کی کلب والے، جو اس کے بغیر اپنی امتیازی حیثیت گنوا بیٹھے تھے، بھی کوشاں تھے مگر لکھمی کا پتا نہ لگتا تھا۔ ماں مکان کا غم بھول چکی تھی۔ اکثر کہتی "مکان جائے بھاڑ میں! لکھمی آ جائے، مکان کو ہم نے کیا کرنا ہے؟" ساس اور سسر بھی حوصلہ بندھاتے رہے۔ مگر اس سے کیا بنتا۔!

لاجونتی نے اس بات کو خوب اچھالا۔ کہتی پھرتی "دیکھنا اور کیا گل کھلتے ہیں۔ بھلے بچے۔ ورنہ خدا جانے کیا بنتا۔ میری بیٹی رانی کے گھر میں موتیوں کا کیا کال ہے، وہ بھی لُٹ جاتی۔"

لاجونتی کا کہا بیکار نہ گیا۔ ایک برس کے بعد پولس ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمارے ہاں آ دھمکی۔ بیوی نے کالج کا پتا بتا دیا۔ ماں نے پوچھا تو کہا کہ ہمارے ایماء پر پولس لکھمی کی تلاش کر رہی ہے۔ مگر انہیں اپنے طور پر لکھمی کی تلاش تھی۔ واقعات یوں رُونما ہوئے:۔

کلکتہ کا ایک نامور سیٹھ اپنے لڑکے کی بارات چڑھا کر امرتسر بیاہنے کے لئے آیا۔ اس کے ساتھ ایک طائفہ کلکتہ کا تھا، ایک بنارس کا۔ ایک دہلی کا۔ آتے ہی امرتسر کا مشہور طائفہ بھی انہوں نے پابند کر لیا۔ راگ رنگ کی محفلیں گرم رہنے لگیں۔ براتی عورتوں کو پنجابی گانے نسبتاً زیادہ پسند آئے۔ اس لئے یہ طائفہ مقبول ہو گیا۔ ایک رات رقاصہ لکھی والا ہار پہن کر آئی۔ ہار اس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ اس نے محفل میں وہ رنگ جمایا کہ بیان سے باہر ہے سیٹھانیوں نے دل کھول کر داد لحن اور دادِ حسن دی۔ ایک سیٹھانی کی نظر ہار پر پڑی تو ہار کے نگ پہچان کر چونک اٹھی۔ پھر غور سے دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "چوٹی گٹھ کتری کہیں کی۔ لا میرا ہار!"۔ اور ہار اس کے گلے سے اتار لیا۔ رقاصہ ہک دک رہ گئی۔ محفل میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیٹھانیاں رقاصہ کے گرد ہو گئیں سازندے بھاگ گئے۔ پولس نے رقاصہ اور ہار کو تحویل میں لے لیا۔ سیٹھ صاحب نے اپنا کندہ نام دکھا دیا۔ رقاصہ نے اپنے بیان میں کہا "ہار مشہور کرکٹر Cricketer لکھی کا عطیہ ہے جو کچھ عرصہ مجھ سے مانوس رہا ہے اس کے علاوہ اس نے مکان بھی مجھے دے دیا تھا"۔ پولس اس سلسلہ میں لکھی کی تلاش میں تھی۔

مجھ سے پوچھا تو میں نے لکھی سے متعلق لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ سیٹھانی کے زیورات کا ڈبہ ریل میں چوری ہو گیا تھا چور پکڑے گئے تھے۔ مال مسروقہ برآمد ہو گیا تھا۔ بجز اس ہار کے۔ مال بانٹتے وقت

عجلت میں یہ ہار پلنگ کے نیچے ہی رہ گیا تھا۔ پہلی تفتیش میں بھی رقاصہ شاملِ تفتیش رہ چکی تھی۔ اور چوروں کی آمدورفت اس کے ہاں ثابت ہو چکی تھی۔ اس لئے رقاصہ کو سزا ہو گئی۔ محمل کی تبدیلی بھی رقاصہ کے خلاف گئی کہ سرقے کو چھپانے کی کوشش سمجھی گئی۔ ہم بچ گئے۔ ماں نے سنا تو اس کے دل پر میل نہ آئی۔ شکر کیا کہ بلا ٹل گئی۔ برسبیلِ تذکرہ یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ہار کی قیمت دس ہزار روپے تھی۔ اب ماں کی کیفیت یہ تھی کہ ہار کا ذکر آتا تو شرمندہ ہو جاتی۔ اور آنکھیں نیچی کر لیتی۔ ماں کی حالت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ اور لکھتی کا غم اسے موت کے قریب ترلا رہا تھا اور لکھتی کے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر اس کے مشورے سے اخبارات میں اجرتاً یہ اشتہار چھپوایا :۔

"بنام پنڈت لکھپت رائے پراشر عرف لکھتی مشہور کرکٹر

لختِ جگر نورِ نظر ! تم ہمارے گھر کے چراغ تھے۔ اگرچہ یہ گھر تمہارے لائق نہ تھا۔ ہم نے اسے تمہارے لائق بنانے کی کوشش کی۔ اگرچہ ہمارے پاس دولت نہ تھی، اس کی تلافی ہم "پیار" سے کرتے رہے۔ تمہیں انکار نہ ہو گا کہ ہم میں سے ہر ایک نے تم پر جان چھڑکی۔ تم چلے گئے یہ گھر اندھیرا ہو گیا۔ واقعات و نتائج کا ہمیں کوئی گلہ نہیں اور نہ اس میں تمہارا کوئی قصور ہے۔ افسوس ہے تو یہ کہ ہم تمہارے کام نہ آسکے۔ میں بسترِ مرگ پر ہوں۔ چند دن کی مہمان ہوں۔ واپس

آجاؤ تو جی اٹھوں گی۔ ہمیں تمہاری دلجوئی مقدم ہے۔ بے کھٹکے چلے آؤ۔ کسی طرح کا وسوسہ جی ہیں نہ لانا۔ اگر پتا دو تو تمہارے بھائی بجاوج تمہیں لے آئیں گے۔

تمہاری دکھیا ماں مایا دیوی بیوہ پنڈت لکھپت رائے اپرشر

نوٹ:- اگر کوئی صاحب لکھپت رائے سے متعلق پتا دیں گے تو شکریہ کے علاوہ یکصد روپیہ بطور شکرانہ نذر کیا جائے گا۔

ڈاکٹر دولت رام پراشر ایم اے پی ایچ ڈی

لارنس روڈ امرتسر

یہ اشتہار متواتر کئی دن مختلف اخباروں میں نکلتا رہا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ہم مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ ماں کی بیماری نے تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ اور وہ راہیٔ ملکِ عدم ہو گئی۔ نزع کے وقت ہمارے پروہت نے رام (خدا) نام جپنے (ورد) کے لئے بار بار کہا مگر اس نے ایک نہ سُنی لکھّی ہی کو یاد کرتی رہی۔

جسے ہم اپنا سمجھتے ہیں اس کی موت کا یقین مشکل ہی سے آتا ہے۔ کریا کرم کر چکنے کے باوجود یقین نہ آتا تھا کہ ماں مر چکی ہے چیتا، ماموں ممانی پُرسا دینے کے لئے آئے۔ رو دھو اور تسلّی تشفی دے کر چلے گئے۔ ساس اور سُسر تو کئی دن ہمارے پاس ہی رہے۔ مگر یہ ایسا خلا تھا کہ پُر نہ ہو سکا۔ ماں کا وجود خدائی رحمت ہُوا کرتا ہے۔ باپ اولاد کو چھوڑ سکتا ہے۔ بھائی بھائی دشمن بن جاتے ہیں۔ بہن بھائی میں ناچاقی ممکن

ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔ مگر ماں کی محبت نیکی بدی، بدنامی۔ نیک نامی، افلاس، تونگری، بیماری تندرستی، خوشی غمی میں یکساں رہتی ہے اور اسے کوئی آنچ نہیں آتی۔

اس امید پر کہ ماں کے انتقال کی خبر لچھمی کو متاثر کئے بغیر نہ رہے گی اور وہ واپس آجائے گا، میں نے ایک اور اشتہار اخباروں میں دے دیا جس کا مضمون یہ تھا:-

"برادرِ عزیز!

باپ پہلے ہی مر چکا ہے۔ ماں مر گئی ہے آخری سانس تک تمہارا نام ہی وردِ زبان رہا۔ اب ہم دو ہی رہ گئے جو ایک دوسرے کو اپنا کہہ سکیں گے۔ آجاؤ تاکہ میں سمجھوں کہ میرا بھی ایک بھائی ہے جس پر بوقتِ ضرورت میں تکیہ کر سکتا ہوں۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

تمہارا بھائی

دولت رام پراشر"

مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ناچار رو دھو کر بیٹھ گئے اور یہ باب بھی ختم ہو گیا!

سہہ لیں میر تم نے ہی یہ خواریاں — نہ بھائی! ہماری تو طاقت نہیں!

وقت کی کرامات! ہمارے گھاؤ مندمل ہو گئے۔ بیٹے کی دائمی جدائی، باپ کی موت، ماں کا انتقال، بھائی کی مفارقت کو ہم نے بھلا دیا۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے نئے ڈھنگ کا ایک ادبی و علمی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر کی

ڈگری حاصل کر لی تھی اور کالج میں صدر شعبہ ہو گیا تھا۔ ہم "ماضی" کو چھوڑ آئے تھے۔ مستقبل پر نگاہیں تھیں۔ اور ہم نے اپنی دنیا "بہ امید قائم" کر لی تھی۔ ہماری تمام تر توجہ اپنی اولاد کا مستقبل بنانے پر مرکوز تھی تاکہ وہ اچھے شہری اور اچھے انسان بن جائیں۔ ملک اور قوم کے کام آسکیں۔ ہم انکی خوراک پوشاک، اطوار اخلاق، صحت اور تعلیم کو مقدم سمجھتے اور اپنی ضروریات اور آسائش کو موخر۔ بیوی تعلیم یافتہ اور مہذب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ مزاج متوازن و متین تھا۔ اور اطوار پاکیزہ اس کے زیر اثر بچے اچھے ماحول میں پرورش پا رہے تھے۔ میں نے اپنے مضمون میں ایک طرح کا "مجتہد العصر" کا درجہ پا لیا تھا اور میری متعدد تصانیف بطور نصاب مختلف یونیورسٹیوں میں منظور کی جا چکی تھیں۔ جن سے مجھے کافی یافت ہو رہی تھی۔ احباب کا دائرہ محدود تھا۔ یا تو وہ معلم تھے یا متعلم۔ قوم کے معمار تھے یا قوم کا سرمایہ۔ ہم اس "نئی مٹی" سے "نئی دنیا" بنانے میں مصروف تھے۔

بیوی ایک شب بچوں کو لے کر کمپنی باغ گئی ہوئی تھی۔ مجھے بھی ایک اہم میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ ذرا دیر سے گھر آیا تو کوٹھی کے میدان میں ایک آدمی کو سر جھکائے بنچ پر بیٹھا پایا۔ تذبذب میں اس کی طرف بڑھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ بدن پر شلوکا تھا اور نیچے تہ بند۔ میں نے غور سے دیکھا۔ تو باپ کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور میں حیران سا رہ گیا۔

اس نے کہا "میں لکھی ہوں" میں اس سے لپٹ گیا۔ زیدہ بوسی کی

اور خوب رویا۔ اس کی کنپٹی کے بال سفید ہو گئے تھے، گال پچک گئے تھے اور وہ قبل از وقت بوڑھا ہو گیا تھا۔ میری دلسوزی کا اس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ وہ مجھ سے الگ ہو کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اندر چلنے کے لئے کہا اس نے نہ کر دی۔ میں نے کھانے کے لیئے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے کپڑے بدلنے کے لئے کہا وہ نہ مانا۔ میں کچھ دیر خاموش اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر روتے روتے دلسوزی سے کہا" ماں کا انتقال ہو گیا"

اس نے بے رُخی سے جواب دیا" مجھے معلوم ہے"

میں نے کہا" رقاصہ قید ہو گئی"

اس نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا، اور ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر توقف کے بعد وہ بولا" وہ بے گناہ تھی"

میں نے کہا" مرتے وقت ماں کی زبان پر تمہارا ہی نام تھا"

اس نے کہا" افسوس! اس نے خالق کی بجائے اپنی تخلیق کا دامن تھام لیا۔"

میں نے کہا" ہم تمہیں بھولے نہیں، اکثر یاد آتے ہو"

اس نے کہا" خیر! یہ داستان بھی دلچسپ اور سبق آموز ہے"

میں اسے اندر لے جانے کے لیئے اٹھا۔ مگر اس نے مجھے بٹھا دیا اور سرد مہری سے کہا" میں تمہارے پاس اپنے ورثے کے لئے آیا ہوں"

میں نے خندہ پیشانی سے کہا" سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ یہیں رہو"

پھر میری آواز رُندھ گئی۔ مشکل سے یہ کہہ سکا" تمہاری آمد، غیر متوقع آمد

نے مجھے نئی زندگی دے دی ہے، کہو کیا چاہتے ہو؟"

اس نے کہا" ہار چوری کا تھا۔ میں نے اچکوں کو دے دیا۔ پاپ کی کمائی پاپ میں لگ گئی۔"

میں نے کہا" بجا"

" مکان پر میرا حق نہ تھا۔ باپ کی کمائی تھی۔ وہی حقدار تھا۔ اس کے بعد ماں۔ اور بعد کو ہم دونوں۔ تم نے زبردستی میرے نام لگوا دیا، ناانصافی کی۔ غیر مباح چیز تھی۔ میں نے ٹھکانے لگا دی۔

میں نے کہا" درست"

" تمہارا پیار یکطرفہ تھا۔ اس جذبۂ محبّت کو جو میری طرف سے اٹھتا تم نے پاس تک پھٹکنے نہ دیا۔ میں نے مایوس ہو کر بے راہ روی اختیار کر لی نتیجہ سامنے ہے"۔

ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہا" شاید تم ٹھیک کہتے ہو" اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اس نے کہا" چلو! ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ میں ورثہ لینے آیا ہوں۔ باپ کے چار ٹھیلے تھے۔ مجھے نصف یعنی دو ٹھیلے دے دو۔ اور گاؤں کی آدھی مٹی۔"

میں نے ٹھیلے تبرکاً محفوظ رکھ لئے تھے۔ مگر اس کا مطالبہ سمجھ نہ پایا۔ میں نے کہا" تم بی اے ہو، ٹھیلوں کو کیا کرو گے؟ میں تمہیں اچھی ملازمت دلا سکتا ہوں۔ بھلا اس کی بھی کیا ضرورت......"

اس نے بات کاٹ کر کہا "میرا مطالبہ میرے حق تک محدود ہے بس خیرات یا رعایت مانگنے نہیں آیا۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا اور ذرا سختی سے کہا "ہاں پھر کیا کہتے ہو؟"

دیکھا کہ وہ ٹلنے والا نہیں۔ میں اسے کوٹھی کے پچھواڑے میں لے گیا ٹھیلے اور مٹی دے دی۔ اس نے ایک ٹھیلے پر دوسرا ٹھیلہ دھرا۔ مٹی کو تہ بند میں پیٹا اور یہ جا وہ جا، کوٹھی سے باہر ہوگیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ نکل چکا تھا۔ میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا باپ پھر سے زندہ ہوگیا ہے اور ٹھیلا لئے جا رہا ہے۔

بیوی آئی تو یہ واردات کہہ سنائی۔ اس نے روتے روتے کہا "بیچارہ دل شکستہ ہے، خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ آگیا ہے تو بھتیجے بھتیجیوں کو ملنے کیوں نہ آئے گا۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ مگر تم نے اسے جانے کیوں دیا؟ میرا انتظار تو کرلیا ہوتا۔ میں اسے جانے نہ دیتی۔"

میں نے کہا "وہ رکنے والا نہ تھا، کیونکر روکتا؟"

ہماری پُرسکون زندگی میں پھر ہیجان پیدا ہوگیا۔ میں نے چچا حسینا اور ماموں مہانی کو بلا بھیجا۔ انہوں نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ اس کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے۔ مگر وہ نہ مانا۔ ٹھیلے کا دھندا نہ چھوڑا۔ چاچا حسینا نے اسے کھیتی باڑی کے لئے ساتھ لے جانا چاہا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ بیوی نے ملنے کی کوشش کی مگر وہ کنی کترا کر نکل جاتا۔ میں نے اپنے دل میں کئی بار سوچا کہ لکھتی اگر ٹھیلا ڈھوتا ہے تو پھر کیا۔؟ باپ بھی تو یہی کام کرتا تھا۔

اگر اعلےٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسے یہ کام پسند ہے تو اس میں کیا برائی یا قباحت ہے؟ بلکہ یہ تو ایک خوبی ہے۔ "مشقت کی عظمت کا ثبوت"۔ مگر دل نہ مانتا۔ اور مجھے یہ کام برا لگتا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ وکالت کرتا، کرکٹ کھیلتا، روپے کماتا۔ اچھے گھر میں بیاہا جاتا۔ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا۔ اور باپ دادا کا نام روشن کرتا۔

میں نے کئی بار ملنے کی کوشش کی، مگر وہ ٹال جاتا۔ آخر ایک دن پوچھتا پوچھتا میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چٹائی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر باہر آ گیا۔ اور کہا "کہیئے"

میں نے کہا "بیٹھ جاؤں تو کہوں"

وہ اندر لے گیا۔ بوریا بچھایا اور مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور تامل کے بعد بولا "فرمائیے! ایک ضروری کام کر رہا ہوں"

میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ کوئی چارپائی کرسی یا میز وہاں نہ تھی۔ کمرہ ستھرا اور سادہ تھا۔ ایک طرف قرینے سے کتابیں لگی ہوئی تھیں اور کچھ فائل تھے جو دیوار کے سہارے ٹکائے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کہا "دیکھو! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ تمہارا دشمن نہیں۔ خیرخواہ ہوں بدخواہ نہیں۔ میری بات مان لو خدارا یہ کام چھوڑ دو۔ آرام چین سے بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔ کرکٹ کھیلو اور نام پیدا کرو۔"

اس نے کہا "ہم ایک ماں باپ کی اولاد تو ہیں مگر حالات نے ہمارے راستے الگ الگ کر دئے ہیں۔ میں تمہارے کام میں دخل نہیں دیتا تم میرے

کام میں مداخلت کیوں کرتے ہو؟ میں ٹھیلے والے کا بیٹا ہوں۔ ٹھیلا ڈھوتا ہوں۔ یہ میرا جدّی پیشہ ہے۔ تم بیچ میں کون؟ اگر تمہیں یہ کام برا لگتا ہے تو نہ کرو۔ میں اپنے افعال و اعمال کا خود ذمّہ دار ہوں اور تم اپنے کئے کے خود جوابدہ! اگر تم میرا راستہ روکو گے تو نتائج سے بے پروا ہو کر میں تمہیں پھاند جاؤں گا" اور اٹھ کر باہر آ گیا

اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر میں نے مداخلت بند کر دی۔ وہ اپنے راستے پر گامزن رہا اور میں اپنے راستے پر۔

وہ لکھی ٹھیلے والا ہی نہ رہا تھا بلکہ وہ "انجمن خدّامِ خلق" کا بانی و صدر بھی تھا۔ اس کی تقلید میں دوسرے ایثار پیشہ لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ فارم ممبری جامع و مختصر تھا۔ صرف یہ عہد لینا پڑتا تھا۔

منکہ . . . . . ولد . . . . . . ذات انسانیت۔ ساکن

. . . . . . یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں اپنی محنت کی کمائی

میں سے حسبِ استعداد ضرورتمند بھائی اور بہنوں کی خدمت

کرتا رہوں گا۔ خدا مجھے استحکام بخشے۔ آمین۔

دستخط

پتہ

ایک زرّیں اَن لکھا اصول یہ بھی تھا کہ کوئی ممبر کسی سے عطیہ قبول نہ کرتا۔ نہ تقسیم کا ذمّہ لیتا۔ اگر کوئی رقم لے کر آتا تو نرمی اور پیار سے کہتا "میرے بھائی! تم اتنی دور ادھر کیوں آ گئے۔ کیا تمہارے ہمسائے میں، تمہاری گلی میں، تمہارے محلّے میں، تمہارے بازار میں۔ تمہارے

متعلقین اور واقف کاروں میں کوئی ایسا نہ تھا کہ اس کے پاس جاتے اور اس کی حاجت روائی کرتے ؟ بھائی ! ان کا حق تم پر فائق ہے ۔ جاؤ انکی خدمت کرو ۔ ان کی دلجوئی کرو ۔ اور ثواب کے حقدار ہو ۔"

"میرا بھائی" اب جگت چاچا بن چکا تھا ۔ اور چاچا لکھی کے نام سے مشہور و معروف تھا ۔ میرے تعلقات استوار اور خوشگوار ہو گئے تھے ۔ اور ہم میاں بیوی اس کے معتقد و مرید بن گئے تھے وہ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آ جاتا ۔ بچوں سے کھیلتا ۔ لائحہ عمل سے متعلق مجھ سے مشورہ بھی لیتا ہیں اُس کے مقاصد سے متفق تھا ۔ اس کے نصب العین اور طریق کار سے خوش اور مطمئین ۔ "میرے بھائی" کی امت بڑھ رہی تھی ۔ انجمن کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی تھیں ۔ ہر شاخ اپنے کام کی آپ ذمہ دار تھی اور ہر فرد اپنے قول و فعل کا آپ ضامن و کفیل ۔ اس سے جذبۂ خود اعتمادی و خود داری بڑھ گیا ۔ اور عمل کو وسعت مل گئی ۔ ممبروں پر صرف یہ فرض عاید ہوتا تھا کہ وہ ضرورتمندوں کے کام آئیں ۔ یعنی اپنے نزدیک کے لوگوں کو علم سے مزیّن کریں ۔ اس طرح ہر گلی محلّے بازار میں اسکول کھل گئے ۔ (فارسی ، اردو ، انگریزی ، ہندی کی تعلیم عام ہو گئی ۔ اور تعلیم کے نتیجہ میں قدرتی طور پر عوام مہذب ہو گئے) حفظِ صحت کے اصول بتائیں (بیماریوں کا تدارک ہو گیا ۔) اپنی کمائی سے ہمسایوں کی مدد کریں ، اور انہیں روزگار پر لگائیں (بے کاری کم ہو گئی) دوسروں کے دکھ درد میں شریک بنیں (ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا) نزاع اور فساد میں مصالحت کرائیں (موافقت

پیدا ہو گئی) اور لوگ ایک طرح کے بھائی چارے میں منسلک ہو گئے اور دنیا ایک سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گئی۔ اور اس خواب کو حقیقت بنانے کی آرزو میں مندرجہ ذیل نظم کا جلسے اور جلوسوں کے اختتام پر لہک لہک کر اور ایک دوسرے کو مخاطب کر کے گانا ضروری ہو گیا

آشکارا اے دوست اک تازہ جہاں ہونے کو ہے
فرشِ خاکی سجدہ گاہِ عرشیاں ہونے کو ہے

ظلمتیں کافور ہوں گی جلوۂ خورشید سے!
روشنی کا ایک فوّارہ رواں ہونے کو ہے

گلخنِ افسردہ تابش سے دمک اٹھنے کو ہے
پھول کھِل کر گلستاں در گلستاں ہونے کو ہے

سیکھ جائے گا بشر اسرارِ تکریمِ بشر
آدمیت کا جہاں اک خانداں ہونے کو ہے

کارواں در کارواں آ جائے گی فصلِ بہار
جلوۂ گلزارِ حسنِ جاوداں ہونے کو ہے

خاک میں مل جائیں گی جور و ستم کی شوکتیں
عدل و انصاف کا ستارہ ضو فشاں ہونے کو ہے

ختم ہو جائے گی آخر کلفتِ ہجر و وصال
عشق ذوقِ وصل سے خلد آشیاں ہونے کو ہے

حرفِ باطل محو ہو جائے گا لوحِ دہر سے
پوری تابانی سے نقشِ حق عیاں ہونے کو ہے
زیرِ دامانِ عدم چھپ جائیں گی ناکامیاں
ابنِ آدم کامیاب و کامراں ہونے کو ہے
دوست! آ اس آرزو کا خیر مقدم ہم کریں
شامل اپنی ہر خوشی میں دوسروں کا غم کریں

دولت مندوں، خوشحال اور بارسوخ لوگوں کو کسی سرپرست کی ضرورت ہُوا کرتی ہے اور نہ کسی حمایتی کی۔ مفلس، ناتواں، سماج کے روندے ہوئے انسان ہی ہیں جو روٹی کپڑے اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ "میرے بھائی" نے اپنی زندگی سوخرالذکر لوگوں کے لئے وقف کر دی اور خود بھی انہی کی طرح رہنے سہنے لگا۔ مزدوری سے کم و بیش دو روپے روزانہ کماتا۔ چھ آنے خود کھاتا اور باقی ضرورت مندوں کو دے دیتا۔ تاکہ وہ اس سے چھوٹا موٹا کام کر کے خود کما سکیں۔ لوگ اسے فرشتۂ رحمت کہتے

ایک دن میں نے اس سے پوچھا "یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟"

اس نے جواب دیا "بھٹی" سے گذرے بغیر کھوٹ کیونکر نکلے۔ آگ نہ لگے تو عود کی خوشبو کیسے پھیلے"؟

میں نے کہا "ہر کہ و مہ کو بلند کیسے کر سکو گے؟ بُرا بُرائی سے کیونکر رکے گا؟"

اس نے کہا "دنیا میں بُرا کوئی بھی نہیں۔ حالات ایسا بنا دیتے ہیں

بہر کیف سب قابلِ اصلاح ہیں۔ میرا دل سب کے لئے اس لئے پسیجتا ہے کہ مجھے کسی سے نفرت یا حقارت نہیں۔ بلا تمیز سب میرے اپنے ہیں۔ مرد میرے بھائی ہیں، عورتیں میری مائیں، اور لڑکیاں میری بہنیں۔"

میں نے اسے گلے لگا کر کہا "برخوردار! زندہ باد! تم نے باپ دادا کا نام روشن کر دیا، اور اپنے لئے سُرگ میں جگہ بنا لی۔"

وہ مسکرا دیا اور سنجیدگی اور متانت سے کہا "مجھے سُرگ میں کون گھسنے دے گا؟ اسے تو دوسرے لوگوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ مجھے جانے کی تمنّا بھی نہیں۔ مجھے تو سرگ کو زمین ہی پر لے آنا ہے تاکہ یہ فرشِ خاکی سجدہ گاہِ عرشیاں بن جائے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ جواب کتنا جامع ہے۔ اگر رقاصہ اسے ٹھکرا نہ دیتی تو ان بلندیوں پر جو آج اسے نصیب ہیں، کبھی نہ پہنچ سکتا۔

اس کے بعد وہ کئی مہینے غائب رہا۔ آیا تو پتا لگا کہ سرکار کے بلاوے پر بھنگیوں کی گندی آبادیوں کے سلسلہ میں لاہور گیا ہوا تھا۔ پھر عرصے تک اس کی شکل نہ دیکھی۔ ایک صبح اچانک پتا لگا کہ وہ رام باغ کی چماروں کی بستی میں آگ بجھاتا اور لوگوں کو بچاتا لقمۂ اجل ہو گیا ہے۔ میں اُدھر پہونچے تو جنازہ تیار تھا۔ اور ہزار ہا مرد و زن گریہ کناں تھے۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ میں بھائی کو کندھا بھی نہ دے سکا۔ جب مرگھٹ میں پہونچے تو میں نے بڑھ کر کہا "میں اس کا حقیقی بڑا بھائی ہوں۔ رسوم خاندانی روایات کے مطابق میرے ہاتھ سے ادا ہونا چاہئیں۔"

ان میں سے ایک نے مجھے پیچھے ڈھکیل کر دور اس جمِ غفیر کی طرف (جو وہاں کھڑا تھا) اشارہ کر کے کہا "وہ ان میں سے کس کا حقیقی بھائی، کس کا باپ کس کا دوست اور کس کے خاندان میں سے نہ تھا؟"

میں شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور میری سمجھ میں آگیا کہ وہ ہم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اور ہم اسے "اپنا" اور "صرف اپنا" سمجھنے میں حق بجانب نہ تھے۔ پھر چند دنوں کے بعد ایک مزدوری پیشہ آدمی آیا۔ دو ٹھیلے اور مٹّی دے گیا کہ یہ چاچا لکھی کی وصیّت تھی۔ میں نے یہ چیزیں سینت کر رکھ لیں یہ دو ٹھیلے ہمارے لئے وہ چند متبرّک ہو گئے کہ میرے باپ اور میرے بھائی کے ڈھوئے ہوئے تھے۔ چاچا سینا آیا تو تسلّی آمیز لہجہ میں کہا "نکو! مایوس و مضطرب نہ ہو، لکھّی نے نیک کام کے لئے جان دے دی۔ وہ امر (زندۂ جاوید) ہو گیا۔ میں نے وصنیت کی موت پر تمہیں دیکھ کر صبر کیا۔ تم بھی اپنے کو دیکھ کر صبر کر لینا۔ تم اور لکھّی ایک ہی مٹّی سے بنے، ایک ہی سانچے میں ڈھلے، ایک ہی کھیت کی مُولی ہو۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے وہ تمہارے وجود میں زندہ ہے" ممانی مر چکی تھی، ماموں آیا رو دھو کر چلا گیا۔ ماسٹر جی اور ماسٹرانی صاحبہ اس صدمۂ جانکاہ میں ہمارے معاون رہے"

ڈاکٹر پروفیسر دولت رام خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔

میں نے کہا "افسوس کہ وہ مر گیا، بُرا ہُوا . . . . ."

اس نے بات کاٹ کر بلند آواز میں سختی سے کہا "کہو بُرا ہُوا وہ اس دنیا سے اٹھ گیا۔ ایک نیک آدمی کم ہو گیا۔ مگر وہ مرا نہیں، زندہ ہے"

________ سنا نہیں!

دنیا میں حیاتِ جاودانی اسی نے پائی
جس نے اپنی مسرّتیں بانٹ دیں۔
دوسروں کے دُکھ سمیٹ لئے
اور خدمت میں جس نے تسکین پائی
زندگی!
ہاں زندگی! اسی کے حصّے میں آئی"

حضرت علّامہ! کیا کہوں! یہ سن کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے اجازت چاہی اور کہا کہ چند دن کی غیر حاضری معاف کرنا۔ مجھے ایک مقدمے کے سلسلے میں دہلی جانا ہے۔ اگلی نشست آیندہ سنیچر (سفتہ) کو ہو گی۔ وہ اٹھا، مجھ سے بغلگیر ہُوا۔ خدا حافظ کہہ کر دروازے تک میرے ساتھ آیا۔

میں نے غالبؔ کا یہ شعر

ہوئی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

بارہا پڑھا اور سنا تھا مگر اس کا اصل مفہوم سمجھ میں آج آیا۔ سنیچر کو واپس آیا تو سنا کہ ڈاکٹر دو دن پہلے انتقال کر چکا تھا۔

اگرچہ میں زندگی بھر اس مقولے پر سختی سے کاربند رہا ہوں کہ

زندگی کا خواب ہے فاصرہ وہ خواب
موت ہی جس کی فقط تعبیر ہو!

میرے آنسو نہ تھمے، اس لئے نہیں
کہ وہ ستم زدہ تھا
یا میرا لنگوٹیا یار تھا
یا میرے ملنے والوں میں سے وہ بہترین، شریف ترین اور قابل ترین انسان تھا
بلکہ اس لئے بھی کہ
"دگر دانائے راز آید کہ ناید[1]!"

آپ کا خیر اندیش
برہم ناتھ دت

---

[1] ترجمہ "کوئی راز آشنا آئے نہ آئے"

اسی مصنّف کے قلم سے

۱۔ ڈال ڈال پات پات
۲۔ پرچمِ ضیاء
۳۔ جواہر پارے
۴۔ برگ و بار
۵۔ اہلِ سیف
۶۔ یونانی شاعر ہومر
۷۔ ذکر و فکر — زیرِ طبع
۸۔ نظمِ منثور — ″
۹۔ منکہ مکتوب الیہ — ″

ملنے کا پتہ

۱۷۔ کرشنا مارکیٹ امرتسر

اغلاط نامہ

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۲۱	۱۵	دھوں	دکھوں
۲۵	۳	ماطرخواہ	خاطرخواہ
	۶	مئی	گئی
	آخری	پنی	اپنی
۲۸	۱	محنت	محنت
	۱۰	دول کے سو	ڈھول کے سوا
	۱۳	ہوتے	جوتے
۳۰	۱	ہوکیا	ہوگیا
۳۲	۲	لکھتی	لکھتّی
۸۵	۱۱	مزارع تابع مرضی	مزارع تابع مرضی مالک
۹۰	۱۸	انتقام	انتظام
۱۶۶	۵	اس کے دلپر میل نہ آئی	وہ دل پہ میل نہ لائی،